بلوچستان کا گوریلا رہنما

جنرل شیروف

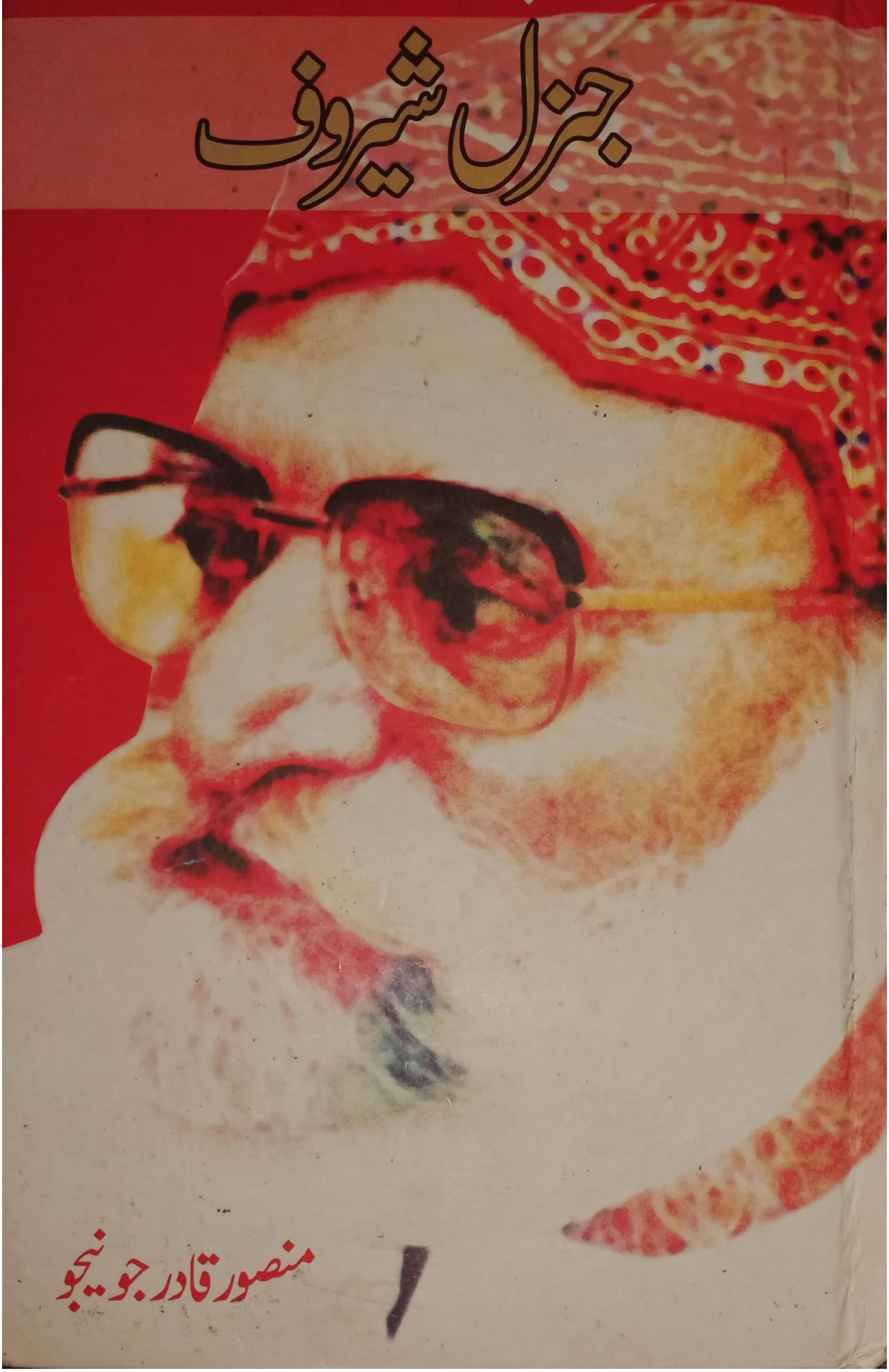

منصور قادر جونیجو

Scanned with CamScanner

بلوچستان کا گوریلا رہنما

جنرل شیروف

مرتب: منصور قادر جونیجو

فکشن ہاؤس
18-مزنگ روڈ لاہور

E-mail: fictionhouse2004@hotmail.com
Ph:042-7249218, 7237430

Scanned with CamScanner

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب : بلوچستان کا گوریلا رہنما
جنرل شیروف
مرتب : منصور قادر جونیجو
پبلشرز : فکشن ہاؤس
18-مزنگ روڈ، لاہور
فون:7249218-7237430
اہتمام : ظہور احمد خاں
کمپوزنگ : فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز : سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور
سرورق : ریاض
اشاعت : 2010ء
قیمت : -/150 روپے

ہیڈ آفس : 18-مزنگ روڈ لاہور، پاکستان

برانچ لاہور
124- ٹیمپل روڈ لاہور
فون:042-7321040

سب آفس حیدر آباد
52,53 رابعہ اسکوائر حیدر چوک گاڑی کھاتہ حیدر آباد
فون:022-2780608

Scanned with CamScanner

انتساب

میں یہ کتاب سندھ کے عظیم سپوت

شہید ہوش محمد شیدی

کے نام منسوب کرتا ہوں۔

جنہوں نے سندھ کی سرزمین کو انگریز کی غلامی سے بچانے کی خاطر

1843ء میں حیدرآباد کے قریب لڑائی لڑتے ہوئے اپنی جان نچھاور کردی۔

منصور قادر جونیجو

Scanned with CamScanner

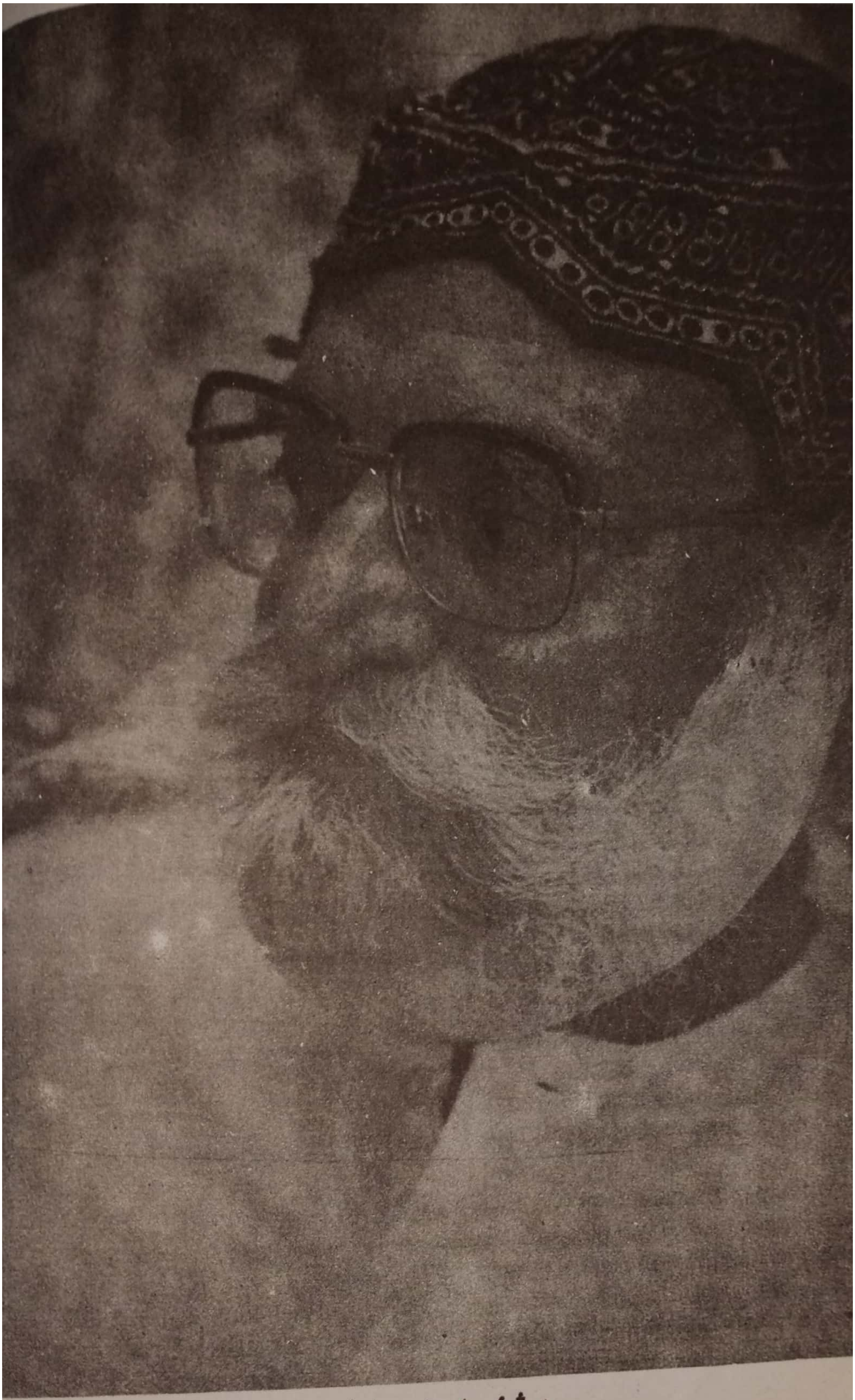

میر شیر محمد مری عرف جنرل شیروف

Scanned with CamScanner

فہرست

1- جے سندھ بلوچستان (پیش لفظ)	منصور قادر جونیجو	7
2- بلوچستان...... مزاحمتی جدوجہد کی تاریخ	احمد سلیم	13
3- میر شیر محمد مری عرف جنرل شیروف	اختر علی خان بلوچ	22
4- جنرل شیروف کے ساتھ جیل میں گذرے ہوئے لمحات	محمد صلاح الدین	30
5- عوام انقلاب اور قومیں آزادی چاہتی ہیں (تقریر)	جنرل شیروف	39
6- کچھ دیر شیر محمد مری کے ساتھ	ہفت روزہ ''لیل ونہار''	54

انٹرویوز

7- پاکستان میں سوشلسٹ انقلاب بلوچستان سے آئے گا	59
8- موجودہ بحران معاشی، سماجی اور سیاسی ہے	63
9- بلوچستان کا سکوت طوفان کی آمد کی خبر دے رہا ہے	72
10- سندھ بلوچستان ایک دوسرے کے فطری اتحادی ہیں	79
11- عام معافی کا اعلان بلوچوں کے ساتھ بھیانک مذاق ہے	89
12- قومیتوں کو حقوق دیجیے، کسانوں اور محنت کشوں کی عظمتوں کو تسلیم کیجیے!	103
13- فوج ہی وفاق کی علامت ہے	113
14- جنرل شیروف (شیر محمد مری)	121
15- آج کا سندھ تبدیلی کا متمنی ہے (جنرل شیروف کا خط، ہفت روزہ ''صبح سندھ'')	139

Scanned with CamScanner

میر شیر محمد مری عرف جنرل شیروف

Scanned with CamScanner

جئے سندھ بلوچستان

(پیش لفظ)

ہم لوگ عام طور پر ہمیشہ حال پہ تکیہ کرتے ہیں ماضی کو بھول جاتے ہیں اور مستقبل پہ ویسے ہی کم سوچتے ہیں۔ ماضی کو بھولنے کے ساتھ ساتھ ہم قدیم تاریخی روایات یعنی تاریخ، تہذیب، تمدن، رسم ورواج، شخصیات جنہوں نے آج کی ترقی کیلئے اپنی قیمتی اور خوبصورت زندگیاں کھپادیں۔ ہم ان سب کو بھول جاتے ہیں۔ ہم اپنے وجودوں میں بسی ہوئی ماضی کی دنیا کو تو کبھی نہیں بھولتے کیونکہ ہم انفرادیت پسندی اور خود پرستی کا شکار ہیں۔ لیکن ہم اپنی اجتماعی تاریخ کو بھول جاتے ہیں جو کہ اپنے وجود کو بھلانے کے مترادف ہے۔ ہم خیالات میں گم ہونے والے وہ شاعر بھی نہیں جو کہہ دے کہ ''یاد ماضی عذاب ہے یارب چھین لے مجھ سے حافظہ میرا'' ہم تو اس دھرتی کے باسی ہیں جس کے شاعر سوتے ہوؤں کو جگانے کی تنبیہ کرتے ہیں۔ ''ستا اٹھی جاگ'' کہنے والے شاہ لطیف کی دھرتی کا ماضی بڑا شاندار رہا ہے۔ لیکن بلوچستان کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ ہم آپ کو بلوچستان کے جس ہیرو سے متعارف کروانا چاہتے ہیں وہ بلوچستان کے پہاڑوں کی طرح بڑا مضبوط اور نڈر ہے۔ ہم اس کے ایک ہاتھ میں شاعری لکھنے والا قلم دیکھتے ہی تو دوسرے ہاتھ میں بندوق دیکھتے ہیں، اس کے عزم اور افکار میں بلوچستان کے غریب عوام آزادی کا جھنڈا لئے زندہ رہے۔ اس عظیم انسان کا نام میر شیر محمد مری ہے۔ بلوچستان کی قومی جدوجہد کی تاریخ کا ایک پرعزم نام۔ میر شیر محمد مری۔ بلوچ قوم پرست رہنما، ماکسٹ سوچ رکھنے والے سیاسی مفکر، بلوچ قومی حقوق کے علمبردار، قوم پرست

Scanned with CamScanner

* The KGB was the main security agency of Soviet union From 13 march 1954 unti 3 dec 1991.

شاعر، ادیب، نقاد اور سب سے بڑھ کر بلوچ سرحدوں اور ننگ و ناموس کے محافظ گوریلا لیڈر بھی تھے۔ حالانکہ وہ سرداروں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے لیکن انہوں نے کبھی دل و جان سے سرداری نظام کو قبول نہیں کیا۔ وہ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے، تاہم وہ دس زبانوں میں بات کر سکتے تھے۔ میر شیر محمد مری ایک ایسے انسان تھے جنہوں نے اپنے لئے بنائے ہوئے اصولوں پر زندگی گذاری اور آخری وقت تک اُن اصولوں پر کاربند رہے۔

میر شیر محمد مری کو بلوچستان کے لوگ پیار اور محبت سے ''شیرو'' پکارتے تھے۔ مری قبیلہ کے سردار خیر بخش مری تو کہتے تھے کہ ''شیرو ہمارا شیر ہے۔'' واقعی اس میں کوئی شک نہیں وہ بلوچوں کے حقوق کیلئے شیروں کی طرح جنگلوں اور پہاڑوں میں لڑتے رہے۔ وہ اپنی زندگی میں سکھ چین اور آرام سے کوسوں دور رہے۔ ان کی اس فطرت نے حکمرانوں کی نیندیں حرام کر دیں۔ جب حکمرانوں کو اس کے خلاف کوئی ایسا ثبوت نہیں ملا کہ اس کو پھنسایا جا سکے تو اسٹیبلشمنٹ کے وفاداروں اور میکاوَلی ازم کے پرستاروں کو سمجھایا گیا کہ اس ''شیرو'' کے نام کے پیچھے ''ف'' کا اضافہ کر کے اس کا تعلق روس سے جوڑ دو اور پھر اس کو کے جی بی کا ایجنٹ بنا کر کیس داخل کر دو۔ بھٹو دوَر حکومت میں یہ کارنامہ سرانجام دیا گیا۔ بھٹو دوَر میں میر شیر محمد مری ''جنرل شیروف'' بن کر تاریخ کے صفحات پر ابھرے۔ اس دوَر میں وہ پہاڑوں پر بلوچ حقوق کی جنگ لڑ رہے تھے۔ وہ الیکشن اور پارلیمانی سیاست سے مایوس ہو کر پہاڑوں پر چڑھ گئے تھے۔ کیونکہ الیکشن کے ذریعے بننے والی بلوچستان کی پارلیامینٹ کو بھٹو صاحب نے توڑ دیا تھا اور گورنر راج قائم کر دیا تھا۔ اس لئے وہ اپنے دوستوں سے اختلاف کر کے ہتھیار اٹھا کر پہاڑوں پر چلے گئے۔ انہیں پتہ تھا کہ پہاڑوں پر اس کا مقابلہ ایک ایسے جنرل سے ہے جو بھٹو صاحب کا وفادار لیکن تاریخ سے ناواقف پنجابی جنرل تھا۔ جس نے اس سے پہلے بنگال کی دھرتی پر فوجی ایکشن کیا تھا اور بنگال کی دھرتی پر قدم رکھتے ہوئے اس نے کہا تھا کہ ''ہمیں

Scanned with CamScanner

بنگالی لوگ نہیں بلکہ بنگالیوں کی زمین چاہیئے!'' لیکن تاریخ نے اسے غلط ثابت کیا۔ وہ جنرل ٹکا خان اپنی موت آپ مرگیا اور تاریخ نے بنگالیوں کو اپنی زمین لوٹا دی۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ پنجابی فاشی جنرل بھٹو صاحب کی پیپلز پارٹی کا مرتے دم تک سیکریٹری جنرل رہا وہی جنرل بلوچستان میں جنرل شیروف کا مدمقابل تھا۔ آج اس جنرل ٹکا خان کا کہیں نام ونشان بھی موجود نہیں لیکن جنرل شیروف تاریخِ بلوچستان کا لازوال کردار بن چکا ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو کے دور حکومت میں جب فوجی ایکشن ہو رہا تھا تو ہم سندھی قوم پرست بڑی شرمندگی محسوس کرتے تھے کیونکہ بھٹو سندھی تھا اور اس کے دوَر حکومت میں بلوچوں کو مارا جارہا تھا۔ اس وقت میں کالج کا طالبعلم تھا۔ ہم نے حیدرآباد سازش کیس میں گرفتار ولی خان، عطاءاللہ مینگل، خیر بخش مری، گل خان نصیر اور دیگر لوگوں کو خطوط لکھے تھے کہ ''بلوچوں کے قتل میں سندھی قوم ملوث نہیں صرف حکمران سندھی ملوث ہیں۔ ہم آپ کے غم اور دکھ میں برابر کے شریک ہیں!'' ان خطوط کا تاریخ میں کیا کردار تھا وہ تو پتہ نہیں لیکن سندھی ہونے کے ناتے ہم اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنے کیلئے ایسا کرتے تھے۔ اس دوَر میں صرف سائیں جی ایم سید اور جئے سندھ تحریک ہی بلوچوں کے حقوق اور جدوجہد کی حامی تھی۔ ویسے سندھی، بلوچ تعلقات میں کبھی کوئی تضاد نہیں رہا۔ لیکن بھٹو دوَر کے فیصلوں کا ان تعلقات پر منفی اثر پڑ رہا تھا۔ ویسے بھی پاکستان کے بدترین آمریتوں اور جنرل شاہی میں سندھی قوم کبھی حصہ دار نہیں رہی بلکہ بدقسمتی سے 1970ء میں جرنیلوں کی سیاسی غلطیوں اور غلط فیصلوں کی وجہ سے ملک دولخت ہوا۔ اور بھٹو صاحب کو دنیا کی تاریخ کا پہلا سویلین چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بنایا گیا۔ ورنہ پاکستانی فوج میں کبھی کوئی سندھی جنرل بننے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ جب پنجاب کے جنرل سیاست میں ناکام ہوئے تو ایک سندھی سیاستدان کو ''جنرل'' بنادیا گیا۔ اور کام نکال کے اسے پنجابی نواب کے قتل کیس میں پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ یہ بھی سندھیوں کے ساتھ تاریخ کا بڑا مذاق ہوا ہے۔

جنرل شیروف 64 برس زندہ رہے۔ اس میں 10 برس بچگانہ اور معصوم زندگی ہوتی ہے جس میں بچہ اپنی ماں باپ کے زیر سایہ رہتا ہے۔ معمولی پرائمری تعلیم حاصل کی، اس کے بعد 10 برس تک بھیڑ بکریاں چرائیں اس کے بعد 13 برس تک قید و بند اور جیل کی دیواروں کے اندر اپنی قوم کی خاطر صعوبتیں اور مصیبتیں برداشت کیں، 12 برس تک ملک سے باہر جلاوطنی اور ملک کے اندر روپوشی میں گذار دیے اور 13 سال تک بلوچستان کے پہاڑوں پر ملکی لٹیروں کے خلاف مسلح جدوجہد کرتے ہوئے گذاری۔ باقی صرف 6 سال بچتے ہیں جس میں انہوں نے شاعری بھی کی ہوگی، سکون اور آرام بھی کیا ہوگا، کتابیں بھی پڑھی ہونگی یا لکھی ہونگی، اپنے بچوں اور دوستوں کو ٹائم دیا ہوگا۔ جنرل شیروف تاریخ کے ایک ایسے عظیم انسان تھے جنھوں نے اپنی زندگی اپنی مظلوم اور محکوم بلوچ قوم کیلئے وقف کر رکھی تھی۔ وہ جدوجہد اور قربانی کا مجسمہ تھے۔ انہوں نے کوئی ایک لمحہ اپنی ذات اور ذاتی کام کیلئے نہیں صرف کیا۔ دنیا میں ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ اور کی زندگی سے سبق ملتا ہے کہ اس کی دوستی میں صرف دکھ ہی دکھ شامل تھے۔ سکھوں سے اس نے کبھی دوستی نہیں رکھی۔ جیل جلاوطنی، روپوشی اور پہاڑ ان کے ساتھی رہے۔ بہت کم لوگوں کی زندگی اس طرح گذرتی ہے۔ وہ پاکستان بننے سے پہلے سیاسی قیدی کی حیثیت سے جیل گئے۔ اس دوران وہ کلکتہ اور دہلی کے سینٹرل جیلوں میں قید رہے۔ پاکستان بننے کے بعد وہ بلوچستان، سبی جیل سے لیکر کراچی جیل تک یاترائیں کیں۔ انہوں نے فارسی، بلوچی، پنجابی، سرائیکی اور سندھی زبان میں شاعری کی۔ وہ دس زبانوں میں بات کر سکتے تھے اور لکھ پڑھ سکتے تھے۔ انہیں انگریزی، بلوچی، فارسی، براہوی، سندھی، پشتو، اردو، سرائیکی، پنجابی اور روسی زبانیں آتی تھیں۔

انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں انکشاف کیا ہے کہ بھٹو دوُر حکومت میں جب سندھ کے اندر سندھی اردو لسانی فسادات ہوئے تھے تو انہوں نے خفیہ طور پر سندھیوں کی مدد کی تھی۔ انہوں نے فخریہ کہا کہ سندھی اور بلوچ بظاہر دیکھنے میں دو ہیں لیکن تاریخی طور پر اندر

سے ایک ہیں۔ انہوں نے کہا کہ سندھی ہمیشہ پرامن رہے ہیں۔ تاریخ کے کسی بھی دوُر میں سندھیوں نے کسی پر حملہ نہیں کیا۔ وہ مظلوم تھے اور اپنی ہی دھرتی پر حملہ آوروں کا نشانہ بنتے رہے ہیں۔ زبان قدرتی تحفہ ہے اور اب ان سے زبان بھی چھینی جارہی تھی۔ اس لئے ہم نے ان کی ہر ممکن مدد کی۔ اس تاریخی حقیقت کی روشنی میں ہم سندھی جنرل شیروف کے مقروض ہیں۔ ہم ان کا اتنا بڑا احسان کبھی بھلا نہیں سکتے۔ نہ ہی ہم ان کا وہ قرض اتار سکتے ہیں۔ میں نے اپنے ضمیر کے آواز پر لبیک کہتے ہوئے جنرل شیروف پر ابتدائی طور پر یہ چھوٹی سی کتاب مرتب کی ہے۔ سندھ میں رہنے الے بلوچوں اور سندھیوں نے ان کو بالکل ہی بھلا دیا تھا۔ ہم ان کی یاد میں یہ حقیر سا تحفہ نذر کرتے ہوئے خوشی محسوس کرر ہے ہیں اور اپنی نئی اور آنے والی نسل کو اپنے ''ہیروز'' سے متعارف کرانے کی شروعات کرر ہے ہیں۔ ہماری لسٹ بہت بڑی ہے۔ ہم ہر اس شخصیت پر کام کریں گے جس نے اپنی زندگی قوم کیلئے وقف کی ہوگی۔ یا کوئی بڑی قربانی دی ہوگی۔ تاکہ لوگ اس سے سبق سیکھیں اور تاریخ میں اپنا اپنا کردار ادا کرنے کیلئے کوئی کام کریں۔

ہم اپنے اس قومی ہیرو جنرل شیروف کی کتاب سے اس سلسلے کی ابتدا کرر ہے ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ وہ ایک عوامی جنرل تھے۔ ان کا کردار اپنے لوگوں کی حفاظت کرنا تھا۔ ان پر روس پرستی کا الزام لگانے والے آج موجود نہیں ہیں لیکن وہ الزام یعنی ''شیروف'' اب ان کی پہچان بن گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے نام پر ایک ادارہ قائم ہو۔ جو ان کی زندگی جدوجہد، علم اور شاعری پر تحقیق کرے۔ خدا مجھے اس کوشش میں کامیاب کرے گا۔ دوستوں کے تعاون سے میں اس عظیم کام کو پایہ تکمیل پر پہنچادوں گا۔ امید ہے کہ پڑھنے والے اس قومی کام میں ساتھ دیں گے۔

منصور قادر جونیجو

حیدر آباد سندھ

Scanned with CamScanner

نقشہ آبادی

بلوچ علاقے

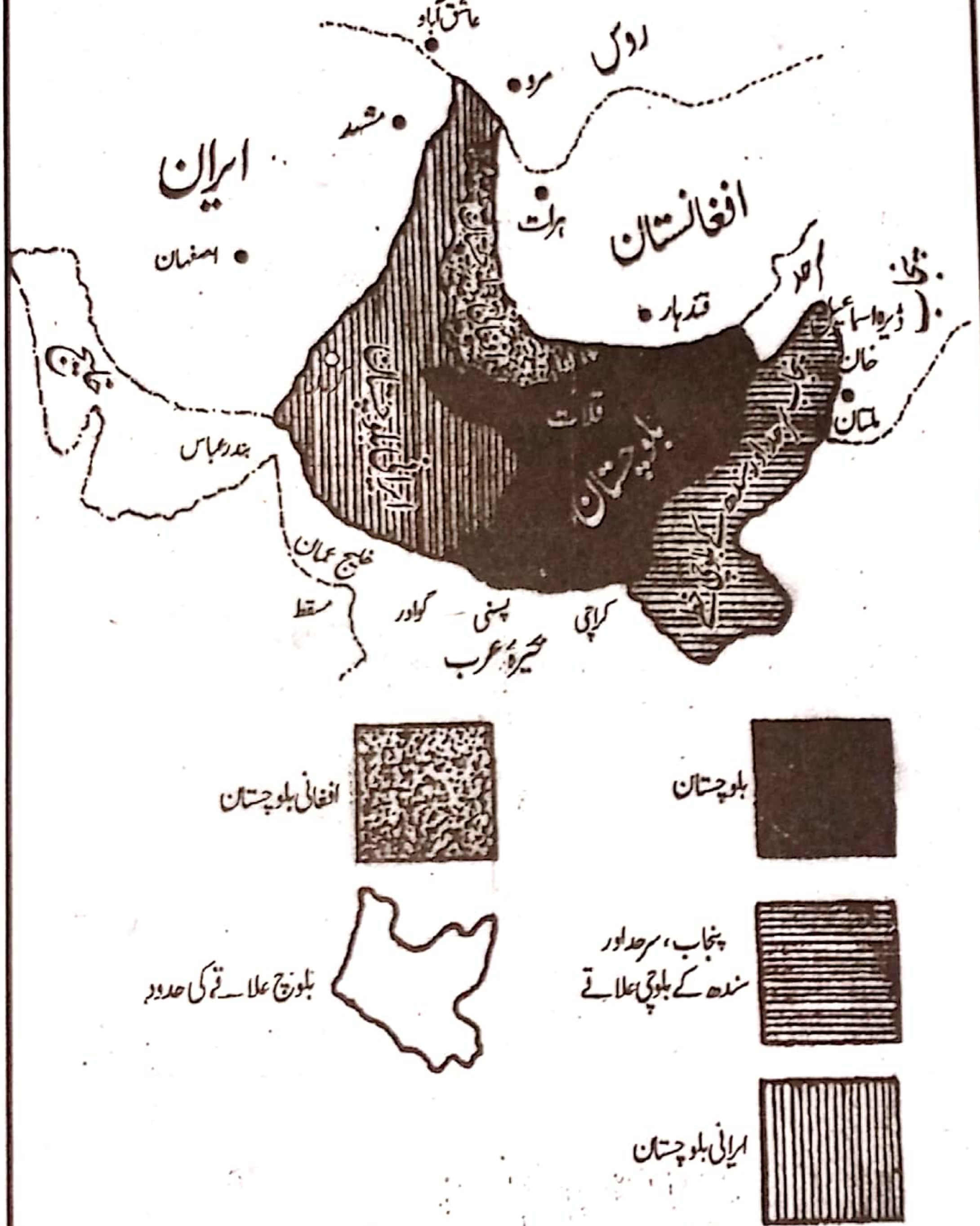

بلوچی علاقے کا کل رقبہ ۳۰،۴۵۰،۰۰ مربع میل

بلوچی ساحل سمندر رونمائی سے بندر عباس تک ۹۶۰ میل

بلوچستان: مزاحمتی جدوجہد کی تاریخ

شہزادہ کریم سے شیر محمد مری تک

اس ملک پاکستان کے انتہائی پسماندہ اور مفلوک الحال حصّہ کی حیثیت سے بلوچستان ہمیشہ جبر اور عدم توجہی کا شکار رہا۔ اقتدار کے مرکزی اور صوبائی ایوانوں میں بلوچ نمائندگی یکسر مفقود رہی۔ ۱۹۴۷ سے طاقت کا استعمال ہوتا رہا اور بلوچ عوام کی جائز شکایات کو بغاوت اور تخریب کاری پر محمول کیا جاتا رہا۔ اس صوبہ میں ۱۹۴۸ء، ۶۰ ۔ ۱۹۵۸، ۶۹ ۔ ۱۹۶۲ اور ۷۷ ۔ ۱۹۷۳ میں فوجی کاروائیاں کی گئیں ۱۹۴۸ میں پاکستان آرمی کی جانب سے فوجی مداخلت پاکستان میں جبری انضمام کے عمل کی ابتداتھی۔

پاکستان کی سیاسی تاریخ کے ساٹھ برسوں کے دوران بلوچستان میں قومی مزاحمتی تحریک کے سلسلے میں پانچ لڑائیاں لڑی گئیں۔ ماریا لیونٹ کے خیال میں پہلا تصادم مزاحمت کا علامتی اظہار تھا۔ دوسرا تصادم ون یونٹ سکیم کے نفاذ سے شروع ہوا اور پانچ برسوں تک جاری رہا۔ بھٹو دور میں ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۷ء تک چند ہزار چھاپہ ماروں کے خلاف ایک لاکھ فوج لڑتی رہی۔ جس کی کمان پنجابی شاونسٹ جنرل ٹکا خان نے کی جو بعد میں پیپلز پارٹی کے سیکریٹری جنرل رہے۔ اقتصادی طور پر محروم اور بہت تھوڑی آبادی والے کمزور علاقہ میں بارہ برسوں سے بھی زیادہ عرصہ کی بربادی نے بلوچ عوام کے دلوں میں گہرے گھاؤ لگائے۔

شہزادہ کریم ۔۔۔ پہلی انقلابی مزاحمت

غیر قانونی الحاق اور خانِ اعظم کی شرمناک پسپائی سے پنجابی فوج کے خلاف پہلی بغاوت کے بارود کو آگ لگی۔ خان کے چھوٹے بھائی اور مکران کے گورنر پرنس عبدالکریم نے جھالاوان کے علاقہ میں مسلح تحریک شروع کردی۔ مکران کو پہلے ہی پاکستان میں شامل کیا جاچکا تھا۔ بعض قوم پرست رہنما بھی اس تحریک میں شامل تھے اور اسے درپردہ خانِ اعظم کی حمایت حاصل تھی۔ پاکستان آرمی کے سرکاری ریکارڈ کے مطابق ۱۹۴۸ء کے موسم بہار میں پرنس عبدالکریم آزاد بلوچ ریاست کے قیام

Scanned with CamScanner

کی غرض سے امداد حاصل کرنے افغانستان گیا تھا۔ اسے وہاں کچھ زیادہ حمایت حاصل نہ ہوئی۔ تقریباً اسی وقت نوروز خان کے داماد میر گوہر خان زرکزئی نے بغاوت کر دی۔ وہ آزاد مکران ریاست قائم کرنا چاہتا تھا۔ یہ بھی افواہیں تھیں کہ پرنس کریم اور میر گوہر مل کر کام رہے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خانِ قلات کی پسپائی کے بعد پرنس کریم نے اسلحہ اور گولہ بارود اور خزانہ اپنے پاس رکھا تھا اور پاکستان کے خلاف بغاوت کا اعلان کیا تھا۔ سات سو کے لگ بھگ پیرد کاروں کی قیادت کرتے ہوئے سرحد عبور کرنے کے بعد جب اس نے افغانستان میں قدم رکھا تو پرنس کریم نے بلوچ نیشنل لبریشن کمیٹی کے نام سے ایک مینی فیسٹو جاری کیا جس میں غیر مشروط الحاق کے سمجھوتے کی مخالفت اور اس سے لاتعلقی کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس سمجھوتے پر خانِ قلات نے دستخط کئے تھے۔ مینی فیسٹو میں قلات کی آزادی کا اعلان کرتے ہوئے پاکستان سے از سرِ نو مذاکرات کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

پرنس کریم نے اپنی چھاپہ مار کارروائیاں جاری رکھیں مگر ناقص منصوبہ بندی اور افغانستان کی حمایت حاصل نہ ہونے کی وجہ سے اُسے اور اُس کے ساتھیوں کو پسپا ہونا پڑا۔ سلیگ ہیری سن کا کہنا ہے کہ پاکستان حکام کی جانب سے جوابی کارروائی کی دھمکی پر خان نے اپنے بھائی کو پسپائی پر آمادہ کیا اور یقین دلایا کہ اسے پاکستانی فوج سے معافی دلا دی جائے گی اور اس کا پورا خیال رکھا جائے گا۔ یہ اطلاعات بھی ہیں کہ پاکستانی حکام نے ایک سمجھوتہ پر دستخط کر دیئے تھے جو ہربوئی کی پہاڑیوں میں پرنس کریم کے نمائندوں کے ساتھ طے ہوا تھا اور جس میں قرآن پر حلف اٹھا کر عہد کیا گیا تھا کہ اس کی پاسداری کی جائے گی مگر کہا جاتا ہے کہ پاکستانی فوجی افسروں نے اس کی خلاف ورزی کی اور گھات لگا کر حملہ کر کے پرنس کریم اور اس کے ایک سو دو ساتھیوں کو جو قلات جا رہے تھے، گرفتار کر دلیا، یہ اعتماد کی شکست اور "ٹوٹے عہد ناموں" کا پہلا اظہار تھا۔ اس کے برعکس پاکستان آرمی کے ذرائع ایک مختلف کہانی اور وہ بھی بڑے ڈرامائی انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ان کے مطابق ۹ جولائی ۱۹۴۸ کو قلات کے وزیر اعلیٰ مسٹر فل (Fell) کو اطلاع ملی کہ پرنس کریم منڈی حاجی میں پہنچ رہا ہے۔ ۱۰ جولائی ۱۹۴۸ کو اس کی تصدیق ہوگئی کہ وہ گذشتہ شب منڈی حاجی پہنچ گیا تھا۔ ۱۱ جولائی کو مسٹر فل نے پرنس کریم کو پیغام بھیجا کہ وہ اسکا لکو میں اس سے ملے مگر کریم وہاں نہ آیا۔ ریاستِ قلات کی فوجوں کے کمانڈر بریگیڈیئر پیرائس نے ژوب ملیشیاء سے کچھ فوجی دستے طلب کئے تا کہ کریم کے محاصرہ میں مدد مل سکے۔ ۱۲ جولائی کو ساڑھے دس بجے لیفٹیننٹ کرنل گلزار (۱۰/۷ بلوچ) قلات کے پولیٹیکل ایجنٹ خان بہادر شیر زمان کو ساتھ لے کر مسٹر فل سے ملنے کیلئے ہربوئی روانہ ہوئے۔ اطلاع ملی تھی کہ کریم اپنے دو سو ساتھیوں کے ہمراہ بل جھال میں ہے۔ کیپٹن عبدالوحید کی قیادت میں ۱۰/۷ بلوچ کو فوری طور پر اسکال کو کی جانب کوچ کا حکم دیا گیا جہاں پہنچ کر لیفٹیننٹ کرنل گلزار نے

کمان سنبھالی۔ ایک کمپنی کو بل جھال سے نکلنے والے راستہ پر لگا دیا گیا۔ رات نو بجکر پندرہ منٹ پر قلات فورسز کے ایک سپاہی نے اطلاع دی کہ اس کی پلٹن پر قریبی پہاڑیوں سے فائرنگ ہوئی ہے جس پر گلزار نے فوری طور پر ایک ریزرو کمپنی طلب کر لی تاکہ پہاڑیوں کو صاف کرایا جا سکے۔ یہ کام نصف شب کے بعد مکمل ہو گیا۔ اگلی صبح آٹھ بجے مسٹر فل سفید پرچم بلند کئے ۱۰/۷ بلوچ کے مورچوں پر پہنچے۔ ٹھیک ۹ بجے پرنس کریم نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس ڈرامے کا اختتام اس وقت ہوا جب ایک خصوصی جرگہ نے عبدالکریم اور اس کے ساتھیوں کو دس سے ایک سال قید اور بھاری جرمانوں کی سزائیں سنائیں۔ پرنس کریم اور محمد حسین عنقا کو دس دس سال قید کی سزا سنائی گئی۔ دوسرے ایک سو پچیس افراد کو ایک سے سات سال قید کی سزائیں دی گئیں۔

پرنس کریم کی بغاوت معمولی نہ تھی۔ بلوچ قومی امنگوں کی راہ میں یہ پہلا سنگِ میل بن گئی۔ انہوں نے اس بات کو کبھی فراموش نہ کیا کہ پاکستان نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہے۔ پنجابی اور مہاجر قیادت نے جو جارحانہ حکمتِ عملی مرکز میں اختیار کی تھی' اس سے بلوچوں میں قوم پرست رجحانات عام ہونے میں بڑی مدد ملی۔ سلیگ ہیری سن کو خیر بخش مری نے بتایا ''ابتدا میں ہماری جدوجہد قبائلی تھی مگر ۱۹۴۷ کے بعد اس نے سیاسی شکل اختیار کر لی۔ ہمارے لوگوں کو آہستہ آہستہ پتہ چل گیا کہ ایک قوم کی حیثیت سے ہماری شناخت کو ختم کر دیا جائے گا لہٰذا اسے بچانے کیلئے ہمیں لڑنا ہو گا۔ پرنس کریم کی بغاوت اس کا پہلا اظہار تھا۔ اس کا مقصد کیا تھا؟ اس کا خود اسے بھی کچھ زیادہ علم نہ تھا مگر اسے اتنا پتہ تھا کہ وہ ریاست چاہتا ہے' کچھ الگ سی۔ اس کے جیل جانے کے بعد یہ اثر ہوا کہ بلوچ شعور کی فکر پھیلنے لگی جو تب سے پھیلتی اور پختہ ہوتی جا رہی ہے۔''

دوسرے بلوچ لیڈروں نے بھی اس فکر کا اظہار کیا۔ اسی مصنف کے ساتھ اظہار خیال کرتے ہوئے عطاءاللہ مینگل نے اس پر حیرت ظاہر کی کہ ''پہلے انہوں نے ہمیں فوج سے مروایا' ہم پر نامناسب شرطیں عائد کیں' ہمیں ہمارے ورثہ سے محروم کر دیا' ہمارے اپنے وسائل پر ہمارا جائز عمل دخل ختم کر دیا اور ان وسائل سے حاصل ہونے والی آمدنی جس کے ہم جائز حقدار ہیں' ہمیں نہیں ملتی۔ اس پر وہ ہمارے متعلق ایسا پدرانہ رویہ اختیار کرنے کے عادی ہیں جیسے ہم بچے ہوں۔'' جب پرنس کریم اور اس کے ساتھی جیل میں تھے' بلوچ قومی تنظیموں نے نہ صرف تمام بلوچ علاقوں کو انتظامی اعتبار سے متحد کرنے اور مکمل خودمختاری کا مطالبہ کیا بلکہ یہ بھی کہا کہ اقتصادی اور ثقافتی بلوچ پسماندگی پر قابو پانے کیلئے زرعی نظام میں جاگیرداری اور بلوچستان کی انتظامی تنظیم ختم کی جائے۔ اب یہ آوازیں بھی بلند ہو رہی ہیں کہ جب سرکاری عہدوں کیلئے نامزدگیاں ہوں تو بلوچ امتیاز پیشِ نظر نہ رکھا جائے۔ ''پاکستان ٹائمز'' نے لکھا کہ کراچی سیکرٹریٹ' مقامی پولیس فورس' فوج اور ملیشیا۔۔۔ ان سب کے دروازے بلوچوں پر بند ہیں' اخبار نے اس کی مذمت کی کہ قیامِ پاکستان کے بعد خیال تھا

کہ مٹھی بھر افسروں کا آمرانہ اختیار ختم ہو جائے گا مگر یہ اُمیدیں دم توڑ گئیں۔ حکام نے بے چینی پر قابو پانے کی غرض سے جو متشددانہ اقدامات کئے' ان کا نتیجہ مزید بے چینی بلکہ کھلم کھلا بغاوت کی صورت میں نکلا۔

نواب نوروز خان۔۔دوسری انقلابی مزاحمت

پرنس کریم اور اس کے متعدد ساتھی جیلوں میں تھے۔ خانِ قلات جگہ جگہ گھومتا رہا۔ یورپ' امریکہ' ترکی' عراق اور سعودی عرب میں وہ اپنے آپ کو'' منافع بخش مصروفیات'' میں الجھائے ہوئے تھا۔ پنجابی قیادت نے فوجی نوکر شاہی کا جو کمپلیکس وضع کر کے چلایا تھا' اب ون یونٹ سکیموں کی تیاریوں میں لگا ہوا تھا۔ پنجابیوں کو ڈر تھا کہ پاکستان کے مغربی حصہ کے تینوں چھوٹے صوبے ان کے خلاف بنگالیوں کے ساتھ اتحاد کر لیں گے۔ جب ۱۹۵۵ء میں مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کو ایک یونٹ میں مدغم کیا گیا'۔ بلوچ لیڈروں نے سخت احتجاج کیا مگر ان کی چیخ و پکار کسی نے نہ سنی۔ ۱۹۵۵ء میں پرنس کریم کی سزا ختم ہونے کے بعد جیل سے رہائی ہوئی تو اس نے ''استمان گل'' (پیپلز پارٹی) قائم کر لی جس نے ون یونٹ کی مخالفت کی اور متحدہ بلوچستان کی تشکیل کا مطالبہ کیا۔ متحدہ بلوچ صوبہ کے اس تصور کو خانِ قلات کی حمایت بھی حاصل تھی۔ ۱۹۵۷ء قریب الاختتام تھا' صدرِ پاکستان کو ون یونٹ حکومت کے زیرِ اہتمام صوبوں کے امور چلانے کے خلاف ہزاروں احتجاجی خطوط موصول ہو رہے تھے۔ ۱۸ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو صدر اور چالیس قبائلی سرداروں کی ایک میٹنگ ہوئی اور اسکندر مرزا نے بڑے ماہرانہ انداز میں مطالبات کا سامنا کیا۔

۶ اکتوبر ۱۹۵۸ کو علی الصبح خانِ قلات بندوقوں اور توپوں کی گھن گرج میں فجر کی نماز ادا کرنے کیلئے بیدار ہوا۔ فوجی ٹرکوں اور بھاری فوجی گاڑیوں نے قلات کو تین اطراف سے گھیرا ہوا تھا۔ کوئٹہ سے قلات تک چھیانوے میل لمبی سڑک پر کوئی حصہ ایسا نہ تھا جس پر مسلح فوجی نہ ہوں۔ قریبی پہاڑی چوٹیوں پر توپیں نصب تھیں۔ پورا قلات ایک ایسے شہر کا منظر پیش کر رہا تھا جسے دشمن نے گھیر رکھا ہو۔ خانِ قلات کا کہنا ہے کہ ''دریافت کرنے پر مجھے بتایا گیا کہ فوج کو' حفاظتی اقدام' کے طور پر بھیجا گیا ہے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ میں نے اسی ہزار قبائیلوں پر مشتمل فوج جمع کر رکھی ہے جو حکومت کے خلاف بغاوت کیلئے قلعہ میں تیار بیٹھی ہے'' ایوب خان نے اپنی سیاسی خود نوشت میں الزام لگایا ہے کہ خانِ قلات صورتحال کو خراب کرنے کا ذمہ دار تھا اور قلات کو پاکستان سے الگ کرنے کی سازش میں مصروف تھا۔ اس وقت قیاس کیا گیا تھا کہ اس کام میں صدر اسکندر مرزا نے اس کا حوصلہ بڑھایا تھا جو اس وقت اپنی آخری کارروائی کی تیاری کر رہے تھے۔ ایوب خان کی طرح

کے کے عزیز، حسن عسکری رضوی، ایم رفیق افضل اور احمد شجاع پاشا جیسے مرکز پسند تاریخ دانوں نے بھی جب الوطنی کا یہی راگ الاپا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ملک میں سیاسی انتشار اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ خان قلات نے اپنی ریاست کی واپسی کا مطالبہ کر دیا تھا۔ اس نے قلات کی پاکستان سے علیحدگی کا اعلان کرتے ہوئے صدر کی دعوت پر قلات کی آئینی حیثیت پر مذاکرات کیلئے کراچی جانے سے انکار کر دیا تھا، میری (قلات) قلعہ سے پاکستانی پرچم اتار کر اپنا پرچم لہرا دیا تھا۔ حکومت نے جب ایک سول افسر کو مسلح پولیس کی ایک جمعیت کے ساتھ اس کی گرفتاری کیلئے بھیجا تو اس کے حامیوں نے فائرنگ کر دی اور اس کی گرفتاری پاکستانی فوج اور خان کے حامیوں کے مابین چار گھنٹے کے مسلح تصادم کے بعد عمل میں آ سکی۔ اس کے ذاتی محافظوں کی معمولی مزاحمت ختم کر کے اسے امتناعی نظر بندی میں لے لیا گیا......

حقیقت میں ون یونٹ اور لسانی بنیاد پر زونل فیڈریشن کے خلاف جدوجہد جاری رہی۔ ۱۹۵۸ء کے موسم گرما کے اختتام تک بلوچستان میں مسلح تصادم ہوتے رہے اور وہاں قومی تحریک کی لہر تیزی سے پھیلتی گئی۔ یہ بات اہم ہے کہ مسلح جھڑپوں کی فوری وجہ مرکزی حُکام کی جانب سے فوجی اڈوں، ہوائی اڈوں اور تیل کے ذخائر کی تعمیر تھی۔ ان کاموں پر عملدرآمد کیلئے کئی بلوچیوں کو ان کے گھروں سے نکلنا پڑا کیونکہ وہ سخت مزاحمت کر رہے تھے۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء کے اوائل میں صورتحال اس وقت مزید پیچیدہ ہو گئی جب صدر اسکندر مرزا نے خانِ قلات میر احمد یار خان کو گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ قلات پر حملہ کے وقت جامع مسجد کی حرمت کا خیال بھی نہ رکھا گیا۔ اس کے مینار پر قلات بلوچ یونین کا سبز و سرخ پرچم لہرا رہا تھا جس پر اللہ اکبر اور کلمۂ طیبہ درج تھا۔ اس پر شدید گولہ باری کی گئی۔ خان اور عام لوگ یہ دیکھ کر سکتے میں آ گئے کہ مسجد کو کھنڈر بنانے کا کام اور کلمۂ طیبہ والے پرچم کی بے حرمتی، کلایو، ویلنگٹن اور نیپیئر جیسے کافروں کے ہاتھوں نہیں بلکہ مسلمان صدرِ پاکستان اسکندر مرزا کے اپنے ہاتھوں ہوئی۔ خان کا کہنا ہے "......اپنے لوگوں کا اس بیدردی سے قتل عام مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ قرآن پاک ہاتھوں میں لے کر میں اپنے کمرے سے باہر نکلا جہاں مجھے کئی بار بانی پاکستان کی تواضع کا اعزاز حاصل ہوا تھا..... میں نے خود کو فوج کے حوالے کر دیا جس نے مجھے ساتھ لے کر قلات کی گلیوں اور بازاروں میں پریڈ کی۔ فوج کی اندھا دھند فائرنگ سے میں اپنے بے شمار لوگوں کو خاک و خون میں گرتے دیکھ چکا تھا۔ میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا...... جب میرے لوگوں نے مجھے دیکھا تو وہ اشک بار آنکھوں سے میرے جانب دوڑے تا کہ مجھے خدا حافظ کہیں مگر ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی گئی۔ میں نے درد و غم سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ پھر لاہور جیل پہنچنے تک پتہ نہیں کیا ہوا۔"

خان کا کہنا ہے کہ یہ غارتگری تھی جس میں گذشتہ ایام کے تاتاریوں کو بھی مات کر دیا گیا تھا، قلات کے محل میں پانچ ہزار فوجیوں نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ اس کی بیوی اور بچوں کو ایک کمرے میں

بند کر کے تالہ لگا دیا گیا تھا۔ پورے محل میں برے طریقے سے غارتگری کی گئی۔ خان کے آباؤ اجداد کا شاہی خزانہ فوج کے کنٹرول میں تھا۔ پرنس کریم اور خان کے ایک چچا پر الزام لگایا گیا کہ آزاد بلوچستان کے قیام کیلئے ایک خفیہ منصوبہ کے سلسلہ میں ان کا افغانستان کے ساتھ رابطہ تھا۔ اس کا واحد ثبوت یہ تھا کہ خان کی افغان بیوی تعطیلات کیلئے افغانستان گئی تھی۔ خان سمیت کئی مصنفین کا خیال ہے کہ یہ الزامات جان بوجھ کر گھڑے گئے تھے تاکہ ملک گیر مارشل لاء کے نفاذ کا جواز پیدا کیا جا سکے۔ سلیگ ہیری سن نے لکھا ہے کہ جس طرح حکومت نے بیان کیا' اس بغاوت کی وسعت اتنی ہمہ گیر نہیں تھی۔ ۶ اکتوبر کے واقعات جنہیں خان نے اپنی یادداشتوں میں اتنا خونین بتایا ہے' ایسے نہ تھے۔ ایک دہائی کی بڑھتی پھیلتی کشیدگی آج تک بلوچستان میں سلسلہ در سلسلہ چلی آ رہی ہے۔ قلات میں مسلح تصادم ہوئے اور پاکستانی حکام نے امریکی فوجی مشیروں کے اشتراک و تعاون سے جو فوجی تنصیبات اور مواصلات کے ذرائع تعمیر کئے تھے' چھاپہ مار بلوچ دستے انہیں تباہ کرتے رہے۔

۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو فوج جھالاوان میں مزید فوجی کارروائی کی غرض سے داخل ہوئی۔ ۹ اکتوبر کو فوج نے واڈ کی جانب پیش قدمی کی جہاں بلوچ قبائلیوں نے مل کر مقابلہ کیا۔ جھالاوان کے قبائلی سردار نواب نوروز خان جو اس وقت نوے سال کے تھے' تقریباً ایک سو چھاپہ ماروں کے سردار بن کر سامنے آئے۔ ان کے گھر پر بمباری کی گئی اور اسے زمین کے برابر کر دیا گیا۔ جائیداد ضبط کر لی گئی تاہم اس فوجی کارروائی سے کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ چھاپہ مار کارروائیاں ایک سال سے بھی زیادہ عرصہ تک جاری رہیں۔ ۱۹۶۰ء کے اوائل میں فریقین کے مابین صلح کے مذاکرات ہوئے۔ سلیگ ہیری سن نے لکھا ہے کہ پاکستانی ذرائع کے مطابق اس موقعہ پر کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ نوروز خان اور ان کے آدمی ون یونٹ منصوبہ کے خاتمہ کی شرط پر ہتھیار ڈالنے کیلئے تیار ہو گئے۔ ان سے یہ وعدہ بھی کیا گیا کہ انہیں عام معافی دیدی جائے گی۔ پرنس کریم کی طرح جیسے ۱۹۴۸ء میں ہوا تھا' اس بار بھی ایک مرتبہ پھر فوج کے نمائندوں نے قرآن پر حلف اٹھا کر عہد نبھانے کی پاسداری کی۔ نواب نوروز اور ان کے ساتھی پہاڑیوں سے اتر آئے اور کرنل ٹکا خان کی کمان میں لڑنے والی فوج کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ ایک بار پھر عہد کی دھجیاں بکھیری گئیں اور فوراً بعد انہیں گرفتار کر کے نازی کیمپوں کی طرح کے ٹارچر سیل' قلی کیمپ میں پہنچا دیا گیا۔ خان قلات نے انکشاف کیا کہ کیمپ میں بارہ سو افراد تھے جن میں نواب' اعلیٰ سے ادنیٰ' ہر کوئی یہاں موجود تھا''......ان میں سے جن کے ناموں کا میں ذکر کرنا چاہوں گا' ان میں میرے ساتھی میر نچاری' میر ولی محمد زرکزئی' میر غلام رسول نچاری اور سبزل خان زہری شامل ہیں۔ ان سب کو حیدرآباد اور سکھر جیلوں میں پھانسی پر لٹکایا گیا۔''بلوچ روایات کے مطابق نواب نوروز کا بیٹا اور پانچ دوسرے ''بلوچستان زندہ باد'' کے نعرے بلند کرتے ہوئے پھانسی پر جھول گئے۔ کہتے ہیں کہ ان میں سے ایک نے اپنی گردن کے ساتھ قرآن مجید باندھا ہوا تھا

Scanned with CamScanner

اوراس کا کہنا تھا کہ اگر ہمیں پھانسی دی جائے گی تو پھر قرآن کو بھی ضرور پھانسی دی جائے گی کیونکہ حکومت نے قرآن پر عہد کر کے اسے توڑا ہے۔نوے سالہ نوروز خان کو عمر قید کی سزا ملی اور وہ کوہلو کے قید خانے میں چل بسا۔اس پر فوج نے مبینہ طور پر تشدد کیا تھا۔

۱۹۵۸ء ۔۶۰ کے اس خونین تصادم کے متعلق بیس سال بعد اگست ۱۹۷۸ء میں خیر بخش مری نے ہیری سن کے ساتھ بات چیت کی دوران کہا جب ۱۹۵۸ء میں نوروز خان پہاڑوں میں گیا تو وہ کیا چاہتا تھا؟ یہ مبہم تھا مگر یہ بلوچ ریاست کی خواہش بھی تھی جس کا اسے خمیازہ بھگتنا پڑا۔اسے ان کے وعدے پر اعتبار تھا مگر اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ اس کے ساتھ جو ہوا' اس نے پڑھے لکھے نوجوانوں پٹی بورژوا اور اگلی نسل پر گہرا اثر ڈالا۔اسے اس کا اظہار کہیں' کچھ بھی کہیں' جو کچھ بعد میں ہوا' وہ تاریخ کا حصہ ہے۔وہ پہاڑوں میں گئے' دوسرے قبائل نے ان کی پیروی کی' مجھے حیرت ہے کہ نوروز خان کے ذہن میں کیا تھا۔وہ قومیت کے حوالہ سے اس کی وضاحت نہ کر سکا مگر وہ اپنی روایات' اپنی شناخت کے احساس کو بچانا چاہتا تھا۔اس کے ذہن میں کوئی بات تھی' بلوچوں کی آزادی کا کوئی تصور تھا۔''

۱۹۶۰ء کے تصادم کے بعد شیر محمد مری کی قیادت میں منظم چھاپہ مار تحریک کی ایک نئی سٹیج اب تیار تھی۔

شیر محمد مری......تیسری انقلابی مزاحمت

۱۹۵۸۔۶۰ کے برسوں میں موت اور لمبی سزاؤں نے جس رنج کو جنم دیا' اس نے ۱۹۶۲۔۶۹ء کے دوران نئی چھاپہ مار جنگ کیلئے سنگین کشیدہ فضا پیدا کر دی تھی۔ابھی خانِ قلات کو رہائی نصیب نہیں ہوئی تھی کہ ۱۹۶۱ء میں بنیادی جمہوریتوں کے تحت مرکزی وصوبائی اسمبلیوں کے ''عام انتخابات'' ہوئے۔انتخابات سے پہلے قلات کے قبائلی عوام کو سخت مشکلوں اور مصیبتوں سے گزرنا پڑا تھا۔خان قلات کا کہنا ہے کہ چھوٹے بڑے' نواب' مزدور' چرواہے۔کی کوئی تمیز روانہ رکھی گئی۔سبھی کیلئے زندگی مشکل بنا دی گئی تھی۔لوگوں کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا۔اس گیر ودار نے شورش اور احتجاج میں مزید اضافہ کر دیا۔خان کا کہنا ہے ''لوگوں کے عزم وحوصلہ میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔وہ گرفتاریاں پیش کرتے رہے' آنے والے دنوں میں بلوچستان کے سرکردہ لیڈروں کو پس دیوار زنداں پہنچا دیا گیا۔ہر طرف تشدد اور ظلم وجبر کا دور دورہ تھا۔بلوچستان کے لوگوں کو برطانوی دور کی بربریت بھی ہیچ نظر آنے لگی۔

اس وجبر تشدد کے باجود بلوچ قیادت اسمبلیوں کے اندر پہنچنے میں کامیاب ہوگئی۔انہوں نے بڑی جرات کے ساتھ مرکزی حکومت اور اس کے مقامی ایجنٹوں کی حرکتوں کو بے نقاب کیا۔قومی اسمبلی میں عطاء اللہ مینگل' خیر بخش مری اور مغربی پاکستان اسمبلی میں جون ۱۹۶۲ء کے دوران احمد نواز

Scanned with CamScanner

بگٹی نے بلوچستان میں پراری (فراری) چھاپہ مار تحریک کے خلاف فوجی کارروائیوں کو پوری طرح ملتشت ازبام کیا۔ اگست ۱۹۶۲ء میں ایوب خان اور اس کے گورنر ملک امیر محمد خان کوئٹہ گئے اور مختلف علاقوں میں بلوچوں کے خلاف فوجی کارروائیوں سے آگاہی حاصل کر کے مزید اقدامات کیلئے احکامات دیئے۔ نواب کالاباغ اور ان کے آقا کی بلوچستان میں موجودگی کو بلوچ لیڈروں نے نظر انداز نہ کیا۔ انہوں نے ایک جلسہ عام میں متنبہ کیا کہ اگر حکومت نے تشدد کا راستہ نہ چھوڑا تو وہ نتائج کے ذمہ دار نہیں ہوں گے۔ اس پر ایوب خان بڑا تیخ پا ہوا۔ فوج کے زبردست پہرے میں ہونے والے جلسہ عام میں اس کا غصہ اتنا بڑھا ہوا تھا کہ اس نے بلوچوں کو یہ دھمکی دینے میں بھی کوئی عار محسوس نہ کی کہ اگر وہ آرام سے نہ بیٹھے تو انہیں ''نیست و نابود'' کر دیا جائے گا۔ خان قلات کا کہنا ہے کہ روایتی طور پر بلوچیوں کو چیلنج قبول کرنے کا شوق ہوتا ہے اور یہ ان کیلئے کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ بلوچ لیڈروں نے اگلے روز ہی ایک اور جلسہ عام بلا لیا جس میں انہوں نے اعلان کیا کہ آمریت کے تابوت میں آخری کیل بلوچ عوام ٹھونکیں گے اور اپنے مقصد کے حصول کیلئے ضروری ہوا تو ہتھیار بھی اٹھائیں گے۔ اس پر ایوب خان نے سخت ردعمل ظاہر کیا اور فوراً بعد تقریباً دو سو بلوچ رہنماؤں اور ان کے پیروکاروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے باوجود کہ بلوچستان میں لوگوں کو کچلنے اور انہیں ہمیشہ کیلئے دبانے کی غرض سے سرکاری مشینری چار برسوں سے پوری شدت کے ساتھ مصروف عمل تھی، بلوچوں کو دبایا نہ جاسکا۔ ۲ نومبر ۱۹۶۲ء کو خان قلات رہا کر دیئے گئے اور ان کے سارے سابق اعزازات بحال ہوگئے مگر یہ چالاکی لڑائی کو روک نہ سکی۔ پراری تحریک نے فوج کی مسلسل موجودگی او فوجی اقدامات میں وسعت کے پیش نظر اپنی چھاپہ مار کارروائیاں شروع کر دیں۔ تحریک کے مرکزی لیڈر شیر محمد مری نے بتایا ''شروع میں ہمارا مقصد محض بلوچ قوم کا تحفظ تھا جسے حکومت پاکستان کچل رہی تھی۔ اس وقت ہم نے اپنے طویل المیعاد مقاصد' آزادی یا پاکستان کے اندر رہتے ہوئے خودمختاری کا تعین نہیں کیا تھا کیونکہ ہم اپنے فوری مقصد کے حصول میں جتے ہوئے تھے یعنی پاکستانی فوج کو بلوچستان سے نکالا جائے' اس سے پہلے غیر منظّم طریقہ سے جو چھاپہ مار کارروائیاں ہوتی رہی تھیں' انہیں ہم سائنسی بنیادوں پر چھاپہ مار جنگ میں تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ ہم اپنی جدوجہد کو نظریاتی پختگی دینا چاہتے تھے تاکہ یہ سال بہ سال جاری رہے۔ اس وقت تک اپنے وقار اور عزت کی توہین پر بلوچ بڑی بہادری سے قبائلی سطح پر نبردآزما رہے تھے مگر انہیں اس طرح سے منظّم نہیں کیا گیا تھا کہ کوئی ان کی توہین کی جرات نہ کرسکتا۔''

۱۹۶۱-۶۳ء میں شیر محمد اور ان کے بیس قریبی رفقا نے بڑی خاموشی سے اپنے منصوبے وضع کیے تاکہ فوج کے ساتھ نبٹنے سے پہلے بنیادی کیمپوں کا ایک جال بچھا دیا جائے۔ جولائی ۱۹۶۳ء تک پینتالیس ہزار مربع میل کے علاقہ میں پراریوں نے بائیس کیمپ قائم کر لئے تھے۔ انہوں نے

Scanned with CamScanner

فوج کے ساتھ بڑے تصادموں سے گریز کیا۔ اس کے برعکس وہ کلاسیکی چھاپہ مار فیشن میں فوجی قافلوں پر گھات لگا کر حملے کرتے، ٹرینوں کو بموں سے اڑاتے، سنتریوں پر فائرنگ کرتے اور فوجی کیمپوں کو نشانہ بناتے۔ جوابی کارروائی کے طور پر فوج نے ہوائی حملے کئے جس سے چھاپہ ماروں کیلئے عام لوگوں کی حمایت میں اضافہ ہوا۔ اس نوع کا پہلا حملہ اس طرح ہوا کہ فوج نے شیر محمد اور اس کے رشتہ داروں کے تیرہ ہزار ایکٹر پر پھیلے ہوئے بادام کے درختوں کو بلڈوزر پھیر کر جڑوں سے اکھاڑ دیا ۔ یہ باغات مری باغات والے سب سے زرخیز علاقہ میں تھے۔ اس اقدام کے نتیجہ میں دسمبر ۱۹۶۵ء میں غار ور میں ہونے والا دوسرا تصادم بھی قابل ذکر ہے۔ ہیری سن نے سرکاری حکام کے ساتھ اپنی ہمدردی کو مخفی نہیں رکھا اور لکھا کہ بلوچوں کے اس الزام میں کوئی صداقت نہیں کہ بھبھور کے قریب دوسرے تصادم میں نیپام بم استعمال کئے گئے تھے۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ بلوچستان میں حکومت مخالف لیڈر پاکستانی فوجوں کے کمانڈر ٹکا خان کو قصائی کہتے تھے۔

بلوچستان میں یہ مسلح تصادم ۱۹۶۹ء تک ہوتے رہے جب یحییٰ خان نے ون یونٹ اسکیم واپس لینے کا حکم دے کر براریوں کو جنگ بندی پر آمادہ کرلیا۔ نیشنل عوامی پارٹی کی حکومت ایک سال سے بھی کم مدت میں چلتی بنی۔ ۱۹۷۲ء میں طارق علی کو غوث بخش بزنجو نے بتایا تھا کہ ''بلوچ طلباء 'بلوچستان سرخ ہے' کے نعروں سے میرا استقبال کرتے رہے ہیں مگر مجھے خوشی ہوگی اگر مرکز ہمیں بلوچستان کو صرف جدید بنانے دے، اسے سرخ بنانے کیلئے کافی وقت پڑا ہے۔'' مرکز کے پاس ایسے کسی قومی کام کیلئے وقت نہ تھا۔ صوبائی حکومت کو کام شروع کئے دس مہینے ہی گزرے تھے کہ فروری ۱۹۷۳ء میں اسے برطرف کر دیا گیا۔ مارشل لا ہو چاہے جمہوری حکومت ہمیشہ بلوچستان کے مسائل کا حل گولی اور بندوق سے نکالا گیا ہے ایوبی دور کی مارشل لاء میں شہید نوروز خان کے بیٹوں کو پھانسیاں دی گئیں اور ذوالفقار علی بھٹو کے جمہوری دور میں بلوچوں کی جمہوری حکومت کو ختم کر کے فوجی آپریشن شروع کیا گیا اور اس جنرل کو بلوچوں کی نسل کشی کرنے کیلئے بھیجا گیا جس نے بنگالیوں کی سرزمین پر جا کر جو پہلا بیان دیا تھا اور جو انسانیت کے منہ پر ایک بڑا تماچہ تھا کہ ہمیں بنگالی عوام نہیں صرف بنگالیوں کی زمین چاہیے۔ تاریخ نے جو نتیجہ دیا وہ بھی دنیا کے سامنے ہے آج جنرل ٹکا خان کی قبر کو بھی لوگ بھول گئے ہیں اور بنگالی اپنی زمین کے خود مالک بن چکے ہیں۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ وہ جنرل ٹکا خان پاکستان پیپلز پارٹی کے مرتے دم تک سیکریٹری جنرل رہے لیکن تاریخ نے اس کو ایسا غرق کیا کہ آج اس کا کوئی نام کہنے والا بھی نہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ چند جرنیلوں نے ملک و قوموں کو مسائل میں مبتلا کر رکھا ہے 1997ء میں جب میاں نواز شریف وزیر اعظم بنے تو اس نے ایٹمی بم کا دھماکہ کرنا چاہا۔ اس نے ایٹمی دھماکہ کی جگہ چاغی بلوچستان منتخب کیا۔ اس وقت بلوچستان کے وزیر اعلیٰ سردار اختر مینگل تھا جس سے کوئی مشورہ نہیں کیا گیا۔

Scanned with CamScanner

میر شیر محمد مری عرف جنرل شیروف

اختر علی خان بلوچ

مرحوم صدر محمد ایوب خان اور صدر و وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے ادوار اقتدار میں مری علاقے میں تحریک مزاحمت نے ایک مری معتبر زادے میر شیر محمد خان مری عرف ''جنرل شیروف'' کو جنم دیا اور وہ ''گوریلا لیڈر'' کی حیثیت سے کوہساروں کی دنیا کے افق سے نمودار ہوا۔ پھر بغاوت کے مقدموں نے انہیں عدالتوں کے کٹہروں میں دیکھا گیا اور پاکستان کی جیلیں برسوں ان کو عذاب و عتاب سے دوچار کرتی رہیں۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ لاکھوں بلوچوں کے دلوں میں جاگزیں ہوا اس پر شاعری کی گئی۔ اس کی بہادری کے قصے زبان زد عام ہوئے۔ میر شیر محمد مری۔ مری قبیلے کی شاخ بجارانی کے گھرانے ''نہالان زئی'' سے تعلق رکھتے تھے ان کے والد میر سیدان خان قبائلی تنازعے میں بے وطن ہو کر قندھار (افغانستان) میں جا بسے۔ وہیں فوت ہوئے اور دفن بھی وہیں ہوئے۔ آپ کے چچا میر شربت خان قبیلے کے معتبر تھے جو سربراہ قبیلہ سردار مہر اللہ کان مری (والد نواب خیر بخش مری) کو لے کر چمن گے اور میر شیر محمد اور انکے کمسن یتیم بھائیوں کو وطن آئے۔ پرورش کی اور پالا پوسا۔ میر شیر محمد مری کے دوسرے دو چھوٹے بھائی میر بہرام خان اور میر ہزار خان۔ میر بہرام خان سرکاری ملازمت میں چلے گئے (بڑے بھائی میر کرم خان زمینداری کرتے تھے۔) مگر میر شیر محمد مری نے سیاست کی وادی میں قدم رکھا اور بڑی مشکل راہوں کے راہی بنے ٹیچری کی ڈرائیوری کی مزدوری کی اور فاقہ کشی بھی کی انہوں نے ۱۹۴۶ء میں ''مظلوم پارٹی'' کی بنیاد رکھی جس کے قیام کا بڑا مقصد سرداروں کے جبری ٹیکسوں اور لوٹ کھسوٹ کے رواجوں کو ختم کرنا تھا۔ اس پارٹی کا پہلا کنونشن پہلے سال ہی ہوا ہزاروں افراد نے شکرت کی اور میر شیر محمد مری گرفتار ہو کر حوالہ زندان ہوئے۔ اس پر مشتعل ہو کر انکے حامی ہزاروں مریوں نے فوجی کیمپ پر حملہ کر دیا اور فوج کو کافی نقصان

پہنچایا وہ جب آزاد ہوئے تو انکے حوصلے پہلے سے دو چند ہو چکے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد انکے عزیز میر نہالان مری انہیں مسلم لیگ کے کیمپ میں بھی لے گئے مگر وہاں ان کا دل نہ لگا اور ان کی کڑوی کسیلی باتوں کو برداشت بھی نہ کیا گیا چنانچہ وہ اس حلقے سے باہر آ گئے۔ ۱۹۶۵ء میں ایوبی دور میں پہلی بار مری بگٹی علاقے پر بمباری کی گئی اور بے قصور لوگوں کی زندگیاں اجیرن کر دی گئیں تو انہوں نے گوریلا وار کی ابتداء کی اور برسوں تحریک مزاحمت میں عملاً حصہ لیا۔ خفیہ 'فنڈ'' کھانے کے لئے ون یونٹ کی بیوروکریسی نہایت سنگدلی اور سفا کی کا ثبوت دیتی رہی ایک اندازے کے مطابق میر شیر محمد مری کے گوریلوں اور فوجی دستوں کے درمیان ۱۹۷۴ء تک ۸۴ جھڑپیں ہوئیں۔ جن کے سبب مری علاقے میں کھڑی فصلیں تباہ ہو گئیں۔ سینکڑوں گھر منہدم ہو گئے اور ہزاروں گھرانے نقل مکانی پر مجبور ہوئے میر نور اللہ بجارانی کا کہنا ہے کہ پوری شوری زندگی میں ان کے بدترین دشمن بھی ان پر بد دیانتی یا جاہ پرستی کی تہمت نہیں لگا سکے دنیا کی کوئی طاقت کسی بھی قیمت پر انہیں خرید نہ سکی ان کی زبان ان کے دل کے ترجمان اور ان کا عمل ہمشہ ان کی نظر کا رفیق رہا میر شیر مھمد مری نا کامی کے لفظ سے قطعاً ناواقف تھے وہ ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے اصولوں میں کسی قسم کی لچک برداشت نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے بڑے بڑے چیلنجوں کو قبول کا پورے بلوچستان میں ان کے معیار کی کوئی اور شخصیت موجود نہیں تھی۔ خدا نے انہیں تدبر و دانش وافر عطا کیا تھا اور وہ اس عطیہ کو اپنی قوم کی فلاح کے لئے وقت کرنے کا عزم رکھتے تھے۔ ان کے اسی اعتماد اور یقین کا نتیجہ تھا کہ وہ اپنے موقف میں کوئی ترمیم کرنے تبدیلی یا مصلحت کرنے پر آمادہ نہ ہو سکے ان کا کہنا تھا کہ انسان اپنے اندر اگر خود اعتمادی اور قوت ارادی پیدا کرلے تو کوئی ایسا کام نہیں جو ناممکن ہو۔

میر شیر محمد مری ساری زندگی اپنے اصلوں پر قائم رہے وہ ملکی سیاست اور حکومت کے رویے سے دلبرداشتہ ہو کر نواب خیر بخش مری کے ہاں افغانستان چلے گئے جو پہلے سے وہاں جلاوطنی کی زندگی گذار رہے تھے وہ دوستی اور ''سنگت'' میں ایک جانثار ساتھی تھے اپنے نواب اور قوم قبیلے اور مقصد کے لئے میر شیر محمد مری اپنی جان تک قربانکر دینے پر تیار ہو جاتے تھے لیکن افسوس کہ افغانستان کے قیام کے دوران وہ اپنے نواب خیر بخش مری سے خفا ہو گئے اور اپنی راہ الگ کر لی۔ انہوں نے بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر اپنے ساتھیوں کو وطن واپسی کا حکم دے دیا اور خود دہلی کے راستے کراچی آ گئے دوسری بار علاج کے لئے دہلی (ہندوستان) گئے

اور وہیں ۱۱ مئی ۱۹۹۳ء کو وفات پا گئے اور تاریخ کا ایک باب لپیٹ کر لے گئے۔

میر شیر محمد خان مری منفرد شخصیت کے مالک تھے ان میں ایک مقناطیسی کشش تھی جو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ جو ایک دفعہ ان کے دائرہ اثر میں آ گیا وہ ہمیشہ کے لئے ان کا حلقہ بگوش ہو گیا میر شیر محمد مری ڈھکے چھپے الفاظ میں کچھ کہنے کے عادی نہیں تھے بلکہ بے باکی اور بے خوفی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ وہ کافی عرصہ وطن سے باہر رہے لیکن اپنی ثقافت کو نہیں بھولے تھے۔ مری بجارانی پگڑی شیر جیسی مونچھیں داڑھی کرتہ مری کٹ چپلی اور واسکٹ آپ کی شخصیت کی پہچان تھے۔ جیل کی طویل زندگی میں معروف صحافی محمد صلاح الدین اور سیاستدانوں میں سید قسور گردیزی عبدالباقی بلوچ اور ''حیدر آباد سازش کیس'' کے تمام لیڈر شامل تھے۔

ملتان کے سید قسور گردیزی میر غوث بخش بزنجو کے گہرے دوست اور ان کے سیاسی ہمسفر تھے میر شیر محمد مری کے بارے میں کہتے تھے کہ ''یہ شخص پاکستان کا فیڈرل کاسترو'' ہے اگر قبائلی سردار اور نواب دل سے اس کے ساتھ ہوں تو یہ واقعی بلوچستان کو ''کیوبا'' بنا دے۔ مگر یہ دیوانہ اکیلا رہے گا اور اکیلا ہی رہ جائے گا'' میر غوث بخش بزنجو سے ایک تقریب میں جب میر شیر محمد مری کی کوئی بات کی گئی تو انہوں نے ہنستے ہوئے کہا ''شیرو ہمارا شیر ہے جسکی گونج اور گرج سے بلوچستان کے مری علاقے سے پنجاب کے مری تک تمام بلد و پست تھرا اٹھتے ہیں کاش ہمارا شیرو ''ایجی ٹیٹر'' کے ساتھ ساتھ سیاستدان بھی ہوتا'' انہوں نے اس محفل میں یہ پیش گوئی کر دی تھی کہ یک دن بقول ان کے شیرو خیر بخش سے الگ ہو جائے گا اور یہ ''علیحدگی دونوں کے لئے نقصان دہ ہوگی۔'' میر شیر محمد مری کابل سے وطن واپسی کے بعد کافی علیل ہو گئے تھے کچھ عرصہ کوہلو اور کوئٹہ میں رہے لیکن افاقہ نہ ہونے کی وجہ سے علاج کے لئے پھر انڈیا چلے گئے وہاں کچھ افاقہ ہوا ۱۲ مئی کو وطن آنے کی تیاری کر رہے تھے کہ ۱۱ مئی کو انہیں دل کا دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ انکی میت بذریعہ طیارہ کراچی کے راستے کوئٹہ لائی گئی اور پھر ایک جلوس کی صورت میں کوہلو پہنچی۔ وہاں ان کا جنازہ پڑھا گیا اور ہزاروں سوگواروں نے انہیں ان کے آبائی قبرستان ''نیسوبا'' میں سپرد خاک کیا۔

میر شیر محمد مری بلوچی زبان و ادب کے معروف مصنف اور محقق بھی تھے ان کی متعدد کتابیں بلوچستان شاعری پر سند تسلیم کی جاتی ہیں۔ افغانستان سے واپسی پر انہوں نے ایک

خصوصی ملاقات میں اس عزم کا اظہار کیا کہ اب وہ بلوچستان کے قبائلی تنازعات ختم کرانے کے لئے لگاتار جدوجہد کریں گے ان کی خواہش تھی کہ بلوچستان کے قبائلی تنازعات کا بلوچ روایات کے مطابق حل نکالا جائے۔ سیاسیات حاضرہ کے بارہ میں ان کا ایک بیان (جو غالباً آخری تھا) ذرائع ابلاغ کی اس طرح زینت بنا۔

''ہمارے ملک میں نفرتوں کی دیواریں اس قدر اونچی ہوگئی ہیں کہ ایک وبے کی آواز دوسرے صوبے میں سنائی نہیں دیتی۔ چاروں صوبے چار بھائیوں کی طرح ہیں ہم سب ان احترام کرتے ہیں لیکن حقوق کے حصول میں کوئی سودے بازی نہیں ہوگی۔ سب کو برابر کے حقوق ملنے چاہئیں قوم کو مجھ سمیت تمام لیڈروں کا احتساب کرنا چاہئے بلوچ کسی کے معاملات میمداخلت نہیں کرتے اور نہ ہی کسی کو اپنے معاملات میں مداخلت کرنے دیں گے۔ بلوچستان آکر احساس ہوا ہے کہ جیسے یتیم بچہ ماں کی گود میں آگیا ہو میری ملک کے حکمرانوں سیاسی رہنماؤں اور خاص کر علماء کرام سے اپیل ہے کہ اب ہوش میں آئیں نفرت کی دیواروں کو گرادیں کیونکہ تاریخ بدل چکی ہے اور بدل رہی ہے۔ مل بیٹھ کر حساب کریںکہ دوسرے کے حقوق کا خیال کریں اگر کسی نے دوسرے کا کچھ دینا ہے تو اسے دے دے ہماری ذمہ داری ہے تو ہم پیار اور محبت کی زبان میں بات کریں اور محبت اور بھائی چارے کی فضا بنائیں اگر سب ایسے ہی ہوتا رہا تو پھر کوئی نہیں بچے گا۔ کیونکہ تاریخ بدل رہی ہے سوویت یونین جیسی سپر پاور ۳۶ لاکھ کی آبادی پر مشتمل تاجکستان کو آزاد کرنے پر مجبور ہوئی اور خود ختم ہوگئی اس لئے بدلتے ہوئے حالات رنظر رکھی چاہئے انہوں نے کہا کہ موجودہ دور میں کسی کو دھونس دھمکی سے دبایا نہیں جاسکتا اور نہ ہی کسی کے حقوق غصب کئے جاسکتے ہیں ہمیں کسی سے نفرت نہیں ہے میں جن کپڑوں میں گیا تھا نہیں کپڑوں میں واپس آیا ہوں اب خوموشی نہیں چلے گی اگر خاموش رہو گے تو ہمیشہ کی طرح بلکتے رہو گے۔ حقوق دیئے نہیں جاتے بلکہ لئے جاتے ہیں بلوچستان میں بلوچ پشتوں صدیوں سے اکھٹے رہتے چلے آرہے ہیں ان کے باہمی ٹکراؤ پر مجھے افسوس ہوا ہے مجھے پس منظر کا علم نہیں بلوچ کسی کی سرزمین پر ٹیڑھی نظر نہیں رکھتے اپنی سرزمین کا ایک انچ بھی کسی کو نہیں دے سکتے قبائلی نظام ٹوٹ رہا ہے مگر قبائلی سوچ موجود ہے اور قبائلی نظام جس قدر جلد ختم ہوگا اتنا ہی بلوچوں کے لئے بہتر ہے اگر بدلتے ہوئے دور کے تقاضوں کے پیش نظر عوام کو ان کے حقوق نہ دئے گئے تو قومیتوں کا سیلاب سب کچھ بہا کرلے جائے گا یہ مطالبہ ہے کہ مری علاقے میں تیل اور گیس

Scanned with CamScanner

نکالنے کے سلسلے میں پورے مری قبیلے کو اعتماد میں لیا جائے اور ۱۹۸۴ء میں صدر ضیاء کے ساتھ کئے جانے والے ہمارے بعض لیڈروں کے سمجھوتے کو شائع کیا جائے حکومت ہمارے ساتھ آنے والے مریوں کو بھیک نہیں بلکہ ان کا حق دے۔ ہمیں قربانی کی کھالیں یا پرانے کپڑوں اور پرانے جوتوں کی ضرورت نہیں بلکہ ایوب اور بھٹو ادوار میں ہم سے جو کچھ چھین لیا گیا تھا ہمیں واپس دیا جائے ہمارے پاس اپنے نقصانات کی مکمل فہرست موجود ہے۔ ہمارے ساتھ جو لوگ افغانستان سے آئے ہیں وہ وہاں بیس سال سے مقیم تھے حکومت سرداری اور نوابی نظام کو مضبوط اور مستحکم کرنے میں مصروف ہے حالات اور وقت میں جو تبدیلی آئی ہے اس نے ہمیں افغانستان سے آنے پر مجبور کیا۔ مجاہدین نے جب کابل پر قبضہ کیا تو مجھے کہا گیا کہ نصف گھنٹے میں گھر چھوڑ دوں کوئی جدوجہد ضائع نہیں ہوتی۔ آج بلوچستان میں جمہوریت ہے بلوچ لیڈروں کے پاس وزارتیں ہیں پہلے کوئی بلوچ کا نام بھی نہیں لیتا تھا۔ یہ سب کچھ ہماری جدوجہد کی بدولت ہے۔ ہمیں آج ناپنے کی کوشش نہ کی جائے ہم نے جو کچھ کل کیلئے کیا آنے والا کل ہی بتائے گا کہ ہمری جدوجہد سے بلوچ قوم کو کیا فائدہ ہوا ہے بلوچ کو کون جات تھا ہماری جدوجہد نے بلوچ کو نہ صرف پاکستان بلکہ پوری دنیا میں متعارف کرایا۔ یہ مستقبل ہی بتائے گا کہ ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا ہے میرا اپنے سردار قبیلہ سے اختلاف پیدا ہوا اس کی بہت سی وجوہات ہیں ہر تنظیم اور پارٹی میں اندرونی اختلافات ہوتے ہیں جنہیں باہر نہیں بتایا جاتا یہ تو تاریخی عمل ہے جو جاری ہے ہم ساتھ تھے اور پھر شاید ہم تاریخی عمل کے تحت آگے بڑھیں گے۔ بلوچستان میں قبائلی نظام ہے جو ٹوٹ رہا ہے مگر اسے ٹوٹنے میں وقت لگے گا ہماری زمین قبائل کی زمین تھی اس لئے سماجی رشتے بھی زمین پر ہی ہوتے تھے مگر اب یہ رشتے ٹوٹ رہے ہیں ہر فرد خود کما رہا ہے اور وہ اپنی مرضی سے کھانا چاہتا ہے پیداواری قوتیں اور ذرائع رشتے جوڑتے تھے مگر اب یہ قوتیں تبدیل ہو رہی ہیں تو رشتے بھی تبدیل ہو رہے ہیں اور یہی ٹکراؤ کا سبب ہے پاکستان میں خصوصاً بلوچوں میں ماضی اور حال کے ٹکراؤ سے قدیم اور جدید کا ٹکراؤ ہو رہا ہے حال کو قبول کرنے کے لئے تیار ہیں اس کے برعکس ماضی کے آقا اور قوم کے وارث اپنے کول سے باہر نہیں نکلنا چاہتے۔

اگر آج ہمیں کہا جا رہا ہے کہ یہ عقوبت خانے سرکاری سرپرستی میں قائم ہوئے ہیں تو یہ غلط نہیں ہے اس ملک کو پیار، عزت وآبرو اور روٹی کی ضرورت ہے۔ لہذا نفرتیں ختم کر دیں۔ پہلے ہی اتنی نفرتیں پیدا ہو چکی ہیں کہ نوجوان ان میں دبا ہوا ہے۔"

راقم الحروف نے ایک معروف جریدے میں ان کی کوئٹہ واپسی کے اس موقع پر حسب ذیل سطور پر مبنی کالم رقم کیا تھا۔

''میر شیر محمد مری جنہیں ایوب خاں کے عہد سے بھٹو مرحوم کے عہد تک گوریلا لیڈر اور جنرل شیروف کے لقب سے پکارا گیا دیار غیر میں طویل جلاوطنی (خود اختیاری) گزار کر کابل سے براستہ دہلی و کراچی کوئٹہ پہنچے تو ان کے استقبال کرائے کے لوگوں نے نہیں بلکہ فی الواقعی ان کے چاہنے والے عزیزوں نے کیا اور ان کا کہنا تھا کہ اول تو مجھے اپنے جلوس نکلوانے یا استقبال کرانے کی کبھی خواہش اور ضرورت نہیں رہی۔ دوئم یہ کہ میرے یا میرے متعلقین کے پاس استقبال کرنے یا جلوس نکلوانے کے لئے رقم نہیں ہے۔ وہ بوڑھے اور ضعیف العمر ہونے کے باوجود اسی گھن گرج سے بولے جو پہلی بار وطن لوٹنے پر کراچی میں جمہوری وطن پارٹی کے زیر اہتمام ایک استقبالیہ سے خطاب میں سننے میں آئی تھی انہیں حکومت سے تو گلہ تھا ہی کہ وہ ابتدا سے ذہناً اپوزیشن لیڈر رہیں اور حکومت سے ناخوش رہنے کو ان کی عادت میں شامل سمجھنا چاہئے۔ اس بار نئی بات یہ ہوئی کہ انہیں اپنے پرانے رفیقوں اور جنم جنم کے ساتھیوں سے گلہ تھا اور وہ گلہ۔۔۔۔ ''گلہ وفائے جفا نما'' ہرگز نہ تھا بلکہ وہ من دیگرم و تو دیگری کی تعبیر بنے ایک فریق و حرف کی زبان بول رہے تھے۔

میر شیر محمد مری بلوچستان کے بہت ہی پرانے سیاسی رہنما ہیں انہوں نے نواب خیر بخش مری کی رفاقت سے پہلے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے عملی سیاست کا آغاز کیا تھا مگر جب اس وقت کے مسلم لیگی اجارہ داروں نے میر غوث بخش بزنجو میر گل خان نصیر میر عبدالعزیز کرد اور سلطان ابراہیم خان کی طرح ان کو بھی منہ نہ لگایا اور عملاً پیچھے دھکیل دیا تو یہ لوگ دوسری طرف چلے گئے اور اپوزیشن کی سیاست ان کا مقدر بن گئی وہ ایک مفکر و محقق شاعر و ادیب اور صاحب تصنیف دانشور ہیں لوگوں کا کہنا ہے کہ آج کے جتنے بھی بقید حیات سردار و معتبر سیاسی لیڈر ہیں آپ ان سب سے سینئر اور بہت سوں کے معلم و اتالیق رہے ہیں میر شیر محمد مری نے اپنی بعض بشری کمزوریوں کے باوصف اس وقت زندگی کی کٹھنائیوں کو گلے لگایا کہ جب جوانی کی رعنائیاں انہیں عیش و مستی کی جانب کھینچ رہی تھیں اور سیاسی دنیا میں ان کی قیمت اور وزن کا تعین کا جا رہا تھا سیاسی عہدوں اور مقتدر کرسیوں کی ایک قطار بھی ان کی منتظر تھی مگر وہ عمر بھر لڑتے رہے عمر بھر قید و بند کی صعوبتیں جھیلتے رہے اور زندگی کے راحت آفرین لمحات ان کا تعاقب

کرتے رہے۔

نواب خیر بخش مری سے وہ عمر میں بڑے تھے مگر روایتاً اپنے موروثی نواب کی بڑائی کے سامنے ساری زندگی سرنگوں رہے اور کوشاں رہے کہ نواب خیر بخش مری کو نوابی کے تخت سلیمان سے نیچے اتار لائیں اور پھٹے پرانے چیتھڑوں میں ملبوس لوگوں سے آشنا کرادیں انکی کوشش سے اتنا ضرور ہوا کہ نواب خیر بخش مری کھدر پوش ہوگئے۔ ''لینن'' کا بیج سینے پر آویزاں کرنے لگے۔ ان کا نوابی کروفر ختم ہوگیا اور ان کا رخ ماسکو کو جانب ہکیا۔ رفاقت اور ریاضت کا یہ سلسلہ جاری رہا تاوقتیکہ یہ سب حضرات گرامی اپنے طور پر کابل میں جلاوطن ہوگئے۔ مگر ناگاہ انکی فکرو نظر کا کعبہ گردش لیل ونہار کی نذر ہوگیا اور کابل کے قیام کے دوران ہی ان کی اور نواب مری کے درمیان زندگی بھر کے یارانے ختم ہوگئے شوراشوری بے نمکی میں بدل گئی اور وہ اپنے سردار کے روبہ رو اور دو بہ دو کچھ احوال واقعی کہنے پر اتر آیئے اس صورت گری کے پس منظر میں کچھ واقعات کی بازگشت سنی گئی۔ ایک عام تاثر کے مطابق کچھ مالی اور ملکیتی یا کاروباری شراکت داری اس اختلاف کا باعث بن گئی بقول شخصے وہ ان عطیات ومراعات میں حصہ مانگنے لگے جو کابل سمیت مبینہ طور پر مختلف ملکوں سے نواب مری کو ملتے رہے تھے۔ دیگر یہ کہ مری علاقہ سے تیل وگیس اور دیگر معدنیات نکالنے کے لئے حکومت پاکستان نے نواب مری یا انکے صاحبزادوں کو (مبینہ طور پر) رائلٹی کی کچھ پیشگی رقم دے دی تھی اور اس فضا میں بہ اہتمام خاص حکومتی وسائل سے انکو وطن لایا گیا تیسری بات یہ ان سے منسوب تھی کہ قبیلے کی زمینیں اور پہاڑ قدیم روایات کے مطابق پورے قبیلہ کی ملکیت ہوتے ہیں ان سے استفادے کا حق بھی پورے قبائلی افراد کو ہوتا ہے رواج کے مطابق قبیلے کے خطہ اراضی اور اس کے پہاڑ جو میلوں بلکہ سینکڑوں میلوں پر پھیلے ہوتے ہیں کی پیداوار کا ایک مخصوص حصہ یا مال مویشیوں کا ایک مخصوص تناسب ہر سال قبیلے کے سردار کو اس مقصد کے لئے دیا جاتا ہے کہ وہ اس سے اپنا اپنے کنبے اور مہمان خانے کے مصارف برداشت کرے گا اس کے بدلے لازمی طور پر قبیلے کے مفادات مفاہمت یکجہتی اور امن وامان کو قائم رکھنے کا ذمہ دار ہوگا مگر میر شیر محمد مری کے نزدیک چونک ان کے نواب سمیت بلوچستان کا کوئی سردار ونواب آج کے زمانے میں قبیلے یا علاقے کی کوئی ذمہ داری سرانجام نہیں دیتا اور قبائلی اپنے معاملات کو خود نمٹاتے ہیں اس لئے قبائلی معاشرے کے اس ''سفید ہاتھی'' سے جان چھڑالینی چاہیے۔ اور قومیتی حقوق کی طرح شہری اور شخصی حقوق کی

راہ بھی استوار ہونی چاہئے۔

میر شیر محمد مری کہتے تھے کہ "انگریز کے دور سے آج تک مجھے غدار کہا گیا لیکن مجھے فخر ہے کہ میرے ٹائٹل میں فرق نہیں آیا حالانکہ میں عمر بھر نفرت کی دیواروں سے ٹکراتا رہوں اور عوام کے حقوق کے لئے جدوجہد کرتا رہا ہوں" ان کا کہنا تھا کہ بلوچ قوم کو اپنے تمام لیڈروں کا احتساب کرنا چاہئے اور سب سے پہلے مجھ سے حساب لیا جائے پھر دوسروں سے بھی حساب لیں۔

میر شیر محمد مری حکومت سے مطالبہ کرتے تھے کہ مری علاقہ میں تیل اور گیس نکالنے کے سلسلے میں پورے مری قبیلے کو اعتماد میں لیا جائے اور ۱۹۸۳ء میں مرحوم ضیاء الحق کے ساتھ بعض لیڈروں کے سمجھوتے کو بھی شائع کیا جائے۔

میر شیر محمد خان مری نے تمام شعوری زندگی "لیفٹ کی سیاست کی اور تغیرات زمانہ آخری سانس تک انہیں متزلزل نہ کر سکے۔ انہوں نے اپنے ترقی پسند نظریات سے نہ صرف اپنے سردار کو بلکہ نصف درجن سربرآوردہ قبائلی چیفس کو بھی متاثر کیا اور ایک عہد کے تمام تعلیم یافتہ نوجوانوں کو بھی ترقی پسند انقلابیت کا پر جوش نعرہ دیا۔ قوم پرستی کا رجحان ابھرا۔ میر شیرو کی بدولت انکی بہت سی مانگیں بہت سے خواب اور مطالبے شرمندہ تعبیر ہوئے۔ عالمی سیاست میں ماحول یکلخت تبدیل ہو گیا اور انکی لیڈر شپ ایک عرصے میں یکے بعد دیگرے اس جہان فانی سے رخصت ہو گئی۔ اس لیڈر شپ کا ایک بڑا رکن میر شیر محمد خان مری تھا۔

میر شیر محمد خان مری عرف "جنرل شیروف" کے بھائی میر بہرام خان جو ایک سابق سینئر ایڈووکیٹ ہیں۔ عملی سیاست میں حصہ لے رہے ہیں اور ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں انہوں نے اپنے قبیلے کے ایک سردارزادے کا مقابلہ کیا تھا اور غالباً سوا سو ووٹوں سے ناکام ہوئے تھے اس خاندان سے جسٹس میر خدا بخش مری کا تعلق ہے۔ معروف مسلم لیگی میر نہالان مری اور سینئر بیوروکریٹس میں اہل قلم میر گلزار خان مری، میر صورت خان مری اور میر نور اللہ بجارانی وغیرہ بھی انکے خاندان سے فرزند ہیں۔ یہ خاندان مریوں میں بجارانی کہلاتا ہے اور اہل تحقیق کہتے ہیں کہ شروع میں قبیلے کی سرداری اسی خاندان میں تھی اور یہ خاندان نامور بلوچ ہیرو امیر چاکر خان رند کی اولاد کہلاتا ہے۔

❁ ❁ ❁

Scanned with CamScanner

جنرل شیروف کے ساتھ جیل میں گزرے ہوئے لمحات

محمد صلاح الدین

آج کل قومی اور بین الاقوامی اہمیت کے ایسے موضوعات کی فراوانی ہے جن میں سے کسی کو بھی تجزیہ کے لئے منتخب کیا جا سکتا تھا لیکن اس بار ذہن کو ایک ایسی شخصیت کی یادوں نے شدت سے اپنی گرفت میں لے لیا ہے جس سے میرا کوئی نظریاتی اور فکری رشتہ تو نہیں لیکن بھٹو دور کی قیدِ مسلسل نے ہم دونوں کو اتنا قریب کر دیا کہ یہ قربت دوستی کے رشتوں میں ڈھل گئی اور رہائی کے بعد بھی طویل وقفوں کے ساتھ ہی سہی، سلام و پیام کا سلسلہ قائم رہا۔ یہ شخصیت تھی جناب شیر محمد مری عرف جنرل شیروف کی جن کا ۱۰ مئی کو دہلی کے ایک اسپتال میں انتقال ہو گیا جہاں وہ گزشتہ دو ماہ سے زیر علاج تھے۔ ان کا جسدِ خاکی کراچی لایا گیا اور گزشتہ ہفتے انہیں اپنے آبائی وطن کو بلوچستان میں سپردخاک کر دیا گیا۔

میر شیر محمد مری کا شمار قومی رہنماؤں میں تو نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کی شخصیت اپنی وضع قطع کی انفرادیت، اپنی سرگرمیوں کی پراسراریت اور اپنے سیاسی بیانات کی ندرت کے باعث پوری قوم کی توجہ اور دلچسپی کا مرکز ضرور بنی رہی ہے۔ ان سے جیل میں ملاقات سے قبل اپنی صحافتی زندگی کے دوران مجھے بھی بلوچستان کے اس نرالے کردار کو قریب سے دیکھنے کی آرزو رہی اور یہ آرزو اخبارات میں شائع ہونے والی اس کی تصاویر نے پیدا کی تھی۔ اخبار جنگ کراچی کے بدھ ۱۲ مئی کے شمارے میں ان کی رحلت سے متعلق خبر میں مرحوم کی عمر ۶۳ سال بتائی گئی ہے مجھے اس میں شبہ ہے۔ اسی ادارے کے انگریزی روزنامے دی نیوز نے گزشتہ سال ۳ جولائی کو اپنے میگزین دی میں ان کا جو انٹرویو شائع کیا تھا اس میں عمر ۷۰ سے اوپر بتائی گئی تھی اور یہی درست معلوم ہوتی ہے۔ وہ پہلی بار ۱۹۴۶ء میں گرفتار ہو کر جیل گئے تھے اور قیام پاکستان کے بعد انہیں ۱۹۴۸ء میں رہا کیا گیا تھا۔ اس لئے غالب امکان یہی ہے کہ وہ

Scanned with CamScanner

۷۰ سال سے زیادہ عمر کے تھے، اب سے ۲۰ سال قبل مارچ ۱۹۷۳ء میں جب کراچی سینٹرل جیل میں ان سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو ان کی داڑھی بالکل سفید ہو چکی تھی اور سر کے بالوں میں بھی سفیدی غالب تھا۔

شیر محمد مری کوہلو میں پیدا ہوئے اور وہیں آسودہ خاک ہوئے۔ انہوں نے مری قبیلے میں آنکھ کھولی لیکن ہوش سنبھالتے ہی قبائلی زندگی اور سرداری نظام کے خلاف بغاوت کی اور سرداری ٹیکس کے خلاف مہم چلانے کے جرم میں جیل گئے۔ اس سے قبل ۱۹۱۸ء میں انگریزوں نے بغاوت کے جرم میں شیر محمد مری کے آباء واجداد کو جلاوطن کر دیا تھا اور دورانِ جنگ ان کے قبیلے کے بہت سے افراد شہید بھی ہو گئے تھے۔ ان کی ولادت بھی جلاوطنی کے زمانے میں ہوئی۔ وہ بعد میں دوبارہ کوہلو آئے۔

قیام پاکستان کے بعد انہوں نے بلوچ قومیت کے نعرے اور اشتراکیت کی علمبرداری کے ساتھ اپنی سیاست کا آغاز کیا۔ نواب خیر بخش مری ان کے فکری قائد تھے اور اکبر بگٹی وعطاء اللہ مینگل وغیرہ بھی نظریاتی حلیف تھے۔ یہ ایک طرف تقسیم ہند اور مسلم قومیت کی بنا پر قیام پاکستان کے مخالف تھے اور دوسری طرف پاکستان سے کٹ کر عظیم بلوچستان کی علیحدہ ریاست کے نہ صرف خواب دیکھتے تھے، بلکہ اس کے لئے پوری طرح سرگرم عمل بھی تھے۔ ایوب خان کے دور میں جب جنرل ٹکا خان نے بلوچستان میں فوجی آپریشن کیا تو شیر محمد مری اپنے دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ پہاڑوں پر چلے گئے اور مسلح کارروائیوں میں مصروف رہے، انہوں نے کچھ عرصہ مچھ جیل میں بھی گزارا۔ بھٹو دور میں جب نعپ کی مینگل حکومت ختم کی گئی تو وہ پھر پہاڑوں پر چلے گئے، انہوں نے مجموعی طور پر ۱۲ سال کا طویل عرصہ پہاڑوں پر گوریلا جنگ میں گزارا اور اس کی قیادت کرنے پر ''جنرل شیروف'' کا خطاب پایا جو ماسکو سے ان کے ذہنی رشتے کی عکاسی کرتا ہے۔ جنرل ضیاء الحق کے دور میں صوبائی گورنر جنرل رحیم الدین کی جانب سے عام معافی کے اعلان کے بعد وہ نیچے اترے۔

۱۹۷۹ء میں وہ صوبے اور ملک کے حالات کو اپنے لئے ناسازگار پا کر کابل چلے گئے۔ وہاں سے دوسرے بیرنی ممالک بھی آنا جانا رہا، ایک خیال یہ بھی ہے کہ جناب اجمل خٹک، سردار خیر بخش مری، شیر محمد مری اور سرحد و بلوچستان کے دوسرے متعدد قوم پرست اشترا کی رہنما کابل میں اس امید پر جمع ہوئے تھے کہ وہاں روس کی مدد سے کمیونسٹ حکومت قائم ہوگی اور اس کی زیر سرپرستی ایک طرف سرخ آندھی کے جلو میں کابل کی زنجیر کا دوسرا سرا دریائے اٹک کے

Scanned with CamScanner

کنارے تک پہنچے گا اور دوسری طرف پاکستانی اور ایرانی بلوچستان پر مشتمل عظم تر بلوچ ریاست وجود میں آجائے گی لیکن مجاہدین نے دس سال کی مسلسل جنگ، ۱۵ لاکھ جانوں کی قربانی اور روسی فوج کے پسپائی کا ناقابل تصور کارنامہ انجام دے کر یہ سارے خواب چکنا چور کر دیئے اور کابل میں لنگر انداز (پشتون و بلوچ قوم پرست رہنما یکے بعد دیگرے وطن واپس آنے پر مجبور ہوگئے۔ کابل کے مناظر نے ان کی فکر و روش پر بھی گہرے اثرات مرتب کئے۔'' جنرل شیروف'' ۶ سال کی خود ساختہ جلاوطنی کے بعد ۱۷ جون ۱۹۹۲ء کو کابل سے پاکستان واپس آئے، کچھ عرصہ خاموشی سے کوہلو میں گزارا اور پھر علاج کے لئے بھارت چلے گئے جہاں ان کا انتقال ہوگیا، وہ گردے کی تکلیف کے پرانے مریض تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد انہوں نے ۱۳ سال جیل میں، ۱۲ سال مسلح جدوجہد میں اور ۱۲ سال بیرنی ممالک میں گزارے۔ وہ کٹر کمیونسٹ تھے اور خود کو کارل مارکس کا پیروکار کہتے تھے۔ استحصالی نظام کے سخت مخالف تھے، سردار خیر بخش مری کو اپنا رہنما سمجھتے تھے لیکن ساتھ ہی ان کے دھیمے مزاج اور سست روی سے سخت نالاں بھی تھے۔ وہ نظریاتی سے زیادہ عملی آدمی تھے اور مسلح جدوجہد پر یقین رکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم کوہلو میں حاصل کی اور اس سے آگے نہ جاسکے مگر حیرت انگیز طور پر بلوچی، بروہی، پشتو، سندھی، سرائیکی، پنجابی، فارسی، اردو، انگریزی اور روسی زبان میں بولنے اور پڑھنے کی استعداد رکھتے تھے اور فارسی، سرائیکی اور پنجابی میں شعر بھی کہتے تھے۔ انہیں اردو کے قدیم شعراء اور بالخصوص میر و غالب کے بہت سے اشعار یاد تھے۔ اپنی پہلی گرفتاری کے بعد وہ کلکتہ اور دہلی کی جیل میں بھی رہے، ان کا ادبی ذوق اور مزاج میں لطیفہ گوئی و بزلہ سنجی کا رنگ دیکھ کر سخت حیرت ہوتی تھی، وہ بت کم گو تھے، ہنستے زیادہ اور بولتے کم تھے مگر چھوٹے چھوٹے فقروں میں اپنی رائے اور تبصروں کا بھرپور اظہار کرتے جن میں طنز و مزاج کا گہرا رچاؤ ہوتا۔ حسبِ موقع اشعار اور کہاوتیں یا محاورے بھی سناتے۔

میں نے ۳ مارچ ۷۴ء سے ۲۵ جولائی ۷۷ء تک مختلف وقفوں کے ساتھ تقریباً ڈھائی سال جیل میں گزارے اور دوبارہ شیر محمد مری کے ساتھ ایک ہی وارڈ (وارڈ نمبر ۱۴) میں کئی ماہ ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا، یہ وارڈ خود جیل کے اندر ایک علیحدہ جیل ہے جس کی دیواریں کسی قلعہ کی بلند فصیلوں کی طرح ہیں، دروازے کے سامنے بھی بلند دیوار کھڑی کی گئی ہے تاکہ روزنِ در سے بھی باہر کی دکھائی نہ دے سکے، یہ ایک وسیع اندھا کنواں ہے جہاں سے صرف آسمان کو دیکھا جاسکتا ہے۔ پہلے یہ خواتین کا وارڈ تھا لیکن بھٹو دور میں اسے انتہائی خطرناک مجرموں کے

لئے مخصوص کر دیا گیا اور ستم ظریفی دیکھئے کہ جئے سندھ تحریک کے مسلح تخریب کاروں، بلوچستان اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے باغی قوم پرستوں اور جنرل شیروف جیسے گوریلا کمانڈر کی صف میں ''خطرناک افراد'' کے طور پر ہمیں بھی شامل کر دیا گیا، اس کا ایک فائدہ یہ ضرور ہوا کہ ان سب سے تبادلۂ خیال کا اور انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، بھٹو حکومت سے اختلاف ہمارے درمیان قدرِ مشترک تھی۔ شیر محمد مری جرأت مندی کے بہت قدردان تھے اس لئے میری آمد پر انہوں نے غیر معمولی مسرت کا اظہار کیا، ان کا چہرہ مہرہ دیکھ کر پہلے دن تو مجھے زیادہ بے تکلف ہونے کی ہمت نہ ہوئی تاہم بعد میں ہم بتدریج کھلتے چلے گئے۔ شیر محمد مری کو اپنے چہرے پر رعب بلکہ ہیبت طاری رکھنے کا شوق جنوں کی حد تک تھا۔ وہ بلاشبہ بڑی مرعوب کن شخصیت کے مالک تھے۔ آنکھیں بڑی کوڑیوں کی طرح پپوٹوں سے باہر نکلی اور ہلکے سرخ بلب کی طرف جلتی ہوئی جن مین لال ڈوریاں الگ سے ابھری ہوئی نظر آتیں۔ چوڑا چکلا اور گوشت سے بھرا ہوا چہرہ جس پر ایک طرف گھنے اور لمبے بالوں کے جوڑے پر لپٹی ہوئی تہ در تہہ سفید پگڑی اور دوسری طرف رسی کی طرف بٹی ہوئی گھنی داڑھی جس کو سنبھالے رکھنے کے لئے وہ کبھی جالی اور کبھی رومال کس کر باندھتے، قد زیادہ طویل نہ تھا لیکن جسم بھرا بھرا اور گٹھا ہوا تھا۔ ایوب خان کے دور میں مسلح جدوجہد کے دوران ایک ٹانگ میں گولی لگی تھی اس لئے معمولی لنگ تھا، آواز بڑی گرجدار تھی، ان کے معمولات سب سے الگ تھے، صبح سیل کا تالا کھلتے ہی پہاڑوں پر استعمال ہونے والے بھاری بھرکم چپلّوں کے ساتھ پورے وارڈ کے کئی چکر لگاتے۔ ان کی رفتار کا ساتھ دینا دوسروں کے لئے بہت مشکل تھا، اس دوران دوسرے لوگ رفع حاجت اور غسل وغیرہ سے فارغ ہو جاتے اور جمعدار بھی صفائی کر چکے ہوتے، تب یہ فراغت اور غسل کے لئے جاتے، ان کی درخواست تھی کہ میں لیٹرین میں موجود ہوں تو کوئی دوسرے صاحب برابر والے لیٹرین کو استعمال نہ کریں اور اسی طرح وہ غسل کر رہے ہوں تو برابر والے غسل خانہ میں کوئی صاحب داخل نہ ہوں، اس احتیاط میں صرف حیاء کا پہلو پیشِ نظر تھا جسے وہ بلوچ تہذیب کا ایک اہم جز و قرار دیتے تھے۔ وہ اپنے جسم کو ہمیشہ پوری طرح ڈھانپ کر رکھتے اور سوتے میں بھی پورا لباس زیب تن کئے رہتے۔ پیروں کے ٹخنوں اور ہاتھوں کے گٹوں یا چہرے کے سوا ان کے جسم کا کوئی حصہ کبھی بے لباس نہیں دیکھا گیا۔ صبح کے وقت انہیں اپنے بالوں کو سنبھالنے پگڑی جمانے اور داڑھی کو سنوارنے میں کم از کم ڈیڑھ دو گھنٹے لگ جاتے، پھر وہ سکون سے ناشتہ کرتے، اخبار دیکھتے اور پھر شریکِ محفل ہو کر تازہ خبروں پر

Scanned with CamScanner

تبصرہ اور تبادلۂ خیال کرتے۔ وارڈ نمبر ۱۴ میں ایک کشادہ اور دو چھوٹے کمرے ہیں، شیر محمد مری ایک چھوٹے کمرے میں تنہا سوتے، قیدیوں کی تعداد بڑھی تو مجبوراً ان کے کمرے میں بھی ایک چارپائی ڈال دی گئی، مجھے ایک رات ان کے ساتھ گزارنے کا اتفاق ہوا۔ سونے سے پہلے انہوں نے معذرت کی کہ آج ساری رات آپ کو نیند نہ آسکے گی، میرے خراٹے سونے نہ دیں گے، آپ صبح خود ہی فیصلہ کرلیں گے کہ اگلی رات بھی یہیں گزارنے کی زحمت کریں گے یا کہیں اور منتقل ہونا پسند کریں گے۔ ان کی بات درست ثابت ہوئی، میں اپنی پیشہ ورانہ زندگی کی لگی بندھی عادت کے مطابق ڈیڑھ دو بجے تک تو ویسے ہی جاگتا رہتا تھا، وہ جلد سونے کے عادی تھے، ان کی آنکھ لگی تو خراٹوں کا شور اس طرح اٹھا جیسے پہاڑوں سے پتھر لڑھکائے جا رہے ہوں۔ میں نے دھیمی روشنی میں اٹھ کر چہرے کا جائزہ لیا تو ہر سانس میں دونوں گال کسی لوہار کے پرانے دھکش کی طرح غبارہ بن کر اٹھتے اور پھر گڑھوں کی صورت میں بیٹھتے دکھائی دیے میں واقعی نماز فجر تک نہ سوسکا۔ صبح ''جنرل شیروف'' نے مسکرا کر میرا حال پوچھا تو میں نے ان کی رائے کی تائید کی اور اگلے روز بڑے کمرے میں منتقل ہوگیا، جناب عبدالباقی بلوچ نے شیر محمد مری سے تنہائی میں گفتگو کا موقع پانے کی خاطر میری جگہ لے لی مگر دو راتوں سے زیادہ کا بارہ بھی نہ اٹھا سکے اور مجھ سے کہنے لگے کہ بھائی ان کے خوفناک خراٹوں میں تو ایک پل سونا مشکل ہے۔ انہوں نے دوسری رات غالباً کسی نا تمام گفتگو کی تکمیل کے لئے گزاری تھی۔

شیر محمد مری اگرچہ زیادہ کھلتے نہ تھے لیکن اپنے عقائد اور سیاسی نظریات کو انہوں نے کبھی پوشیدہ نہ رکھا اور یہ بھی صفائی سے بتادیا کہ شراب کا عادی ہوں مگر بیوی کے سوا کبھی کسی غیر عورت کو ہاتھ نہیں لگایا، بلوچ تہذیب میں یہ ناقابلِ معافی گناہ ہے، ہم آبرو کے محافظ ہیں، کسی کی آبرو پر کبھی حملہ نہیں کرتے۔ جیل میں چونکہ کاغذ، قلم اور کتاب وغیرہ پر پابندی تھی اس لئے جتنا وقت جاگتے گزرتا سب گفتگو کی نذر ہوتا۔ شیر محمد مری سے ملک کی صورتحال کے علاوہ قومیت کے اسلامی اور اشتراکی کی تصور، معاشی نظریات، روس اور دیگر کمیونسٹ ممالک کی صورتحال اور مذہب وغیرہ کے موضوعات پر تبالۂ خیال رہتا۔ ان کی فکر الحاد کی حدوں کو چھوتی تھی وہ خدا کے وجود کا انکار تو نہ کرتے لیکن انسان کی اجتماعی زندگی میں اس کا عمل دخل انہیں پسند نہ تھا۔ وہ معاشی انصاف پر بہت زور دیتے اور اس کا آئیڈیل ان کے نزدیک صرف کارل مارکس کی فکر اور روس میں لینن کا قائم کردہ اشتراکی نظام تھے۔ اس سلسلہ میں بعض اوقات بڑی طویل اور دلچسپ گفتگو ہوتی۔ میں ان سے کہتا کہ اشتراکیت سرمایہ دارانہ نظام کا علاج نہیں

بلکہ اس کی انتہا ہے۔ ۲۲ یا ۸۰ خاندانوں میں دولت کے ارتکاز کا مطلب ہے سرمایہ داری اور کسی ایک فرد یا پارٹی کے ہاتھ میں تمام وسائلِ معیشیت اور سیاسی اختیارات بلکہ کلیت پسندانہ (Totalitarian) تصور کے تحت ملک کی ہر شے سونپ دینا اور باقی سب کو اس کا تنخواہ دار نوکر بنا دینا یہ معاشی انصاف ہے جو میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ صورت یہ ہو کہ ۲۲ کی دولت ۴۴ یا ۸۰ کی دولت تقسیم ہو کر ۱۶۰ کے حصے میں آئے اور بتدریج نچلی سطح پر بکھرتی اور پھیلتی چلی جائے تو اسے انصاف کا عمل کہا جا سکتا ہے لیکن یہ مزید اوپر چڑھ جائے اور صرف حکمران پارٹی کے تصرف میں چلی جائے تو یہ غربت کی یکساں تقسیم تو ہو سکتی ہے، خوشحالی کی تقسیم کیسے قرار دی جائے۔ میں ان سے یہ چبھتا ہوا سوال بھی کرتا کہ اشتراکیت ہے تو غریبوں کی نجات دہندہ مگر اس سے بلوچستان کے بڑے بڑے سرداروں، صوبہ سرحد کے دولتمندوں، خانوں، پنجاب کے جاگیرداروں اور سندھ کے وڈیروں کو اتنی دلچسپی کیوں ہے؟۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ کامیابی کی صورت میں چھوٹی چھوٹی جاگیروں کے دائرے سے باہر نکل کر ایک بڑی ریاست کے حکمران کی حیثیت سے سب کچھ اپنے کنٹرول میں لے لینے کی آرزو رکھتے ہوں، جیسے بھٹو نے نیشنلائزیشن کے نام پر ملک کے کارخانوں، بنکوں، جہاز راں کمپنیوں، بیمہ کمپنیوں، تعلیمی اداروں اور دیگر شعبوں پر قبضہ کر کے ان کے وسائل اور ملازمتوں پر اپنا کنٹرول قائم کر دیا ہے اور اب وہ لاڑکانہ کی جاگیر کے مقابلے میں ہزاروں گنا بڑی جاگیر اپنے تصرف میں رکھتے ہیں۔ سیاسی اقتدار کا آلہ (Instrument) تو اس طرح معاشی استحصال کا سب سے بڑا ذریعہ بن جاتا ہے، یہ انصاف ہے یا ظلم؟ وہ کہتے میں حقیقی کمیونزم کی بات کرتا ہوں، اس فراڈ سوشلزم کا قائل نہیں ہوں۔ دوسرے کمیونسٹوں کی طرح ان کا جواب بھی یہی ہوتا کہ سوویت یونین اور دیگر سوشلسٹ ریاستیں تو ابھی عبوری دور سے گزر رہی ہیں کمیونزم کی منزل ابھی دور ہے جہاں ریاست کا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔

شیر محمد مری کا مطالعۂ مذہب بہت محدود تھا بلکہ اپنی زندگی کا ایک واقعہ سناتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ میں تو اس واقعہ کے بعد مذہب سے بیزار ہو گیا اور میرے دل میں اس کے خلاف شدید نفرت پیدا ہو گی۔ انہوں نے بتایا کہ بلوچستان میں مذہبی تعلیم کا انتظام غالباً برصغیر کے تمام صوبوں کے مقابلے میں سب سے کم رہا ہے، یہاں کے لوگ ملتان یا پنجاب اور سندھ کے قریبی مدارس میں تعلیم کے لئے جاتے تھے، یہ واپس آ کر دینی تعلیم کم دیتے، لوٹ مار زیادہ کرتے، ہر مذہبی رسم پر رقم وصول کرتے حتیٰ کہ نمازِ جنازہ پڑھانے کے بھی پیسے لیتے۔ کوہلو کے

Scanned with CamScanner

قریب ہی دو یتیم بچوں کی ماں کا انتقال ہوگیا، مولوی صاحب نمازِ جنازہ پڑھانے آئے، ان بچوں کے پاس ایک بکری کے سوا کچھ نہ تھا، وہ اسی کو کھول کر اپنے ساتھ لے گئے بچے روتے ہوئے میرے پاس آئے، میں فوراً گھوڑے پر سوار ہوا، ان بچوں کو بھی ساتھ لیا اور مولوی صاحب کی رہائش گاہ پہنچا بکری باہر بندھی ہوئی تھی، بچوں نے دیکھتے ہی اسے پہچان لیا، میں نے مولوی صاحب کو گھر سے باہر نکلنے کا حکم دیا۔ وہ لرزتے کانپتے باہر آئے تو میں نے انہیں بہت سخت ڈانٹ پلائی اور بکری بچوں کے حوالے کی، اس واقعہ نے مذہبی شخصیتوں کو میرے سامنے ایک ظالم اور استحصالی طبقے کی صورت میں پیش کیا اور مجھے ان سے نفرت ہوگئی۔ میں نے یہ واقعہ سن کر شیر محمد مری سے کہا کہ کیا انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے والے آپ کے اپنے اسلاف اور پھر پورے برصغیر میں آزادی کی تحریک چلانے اور اس کی قیادت کرنے والے تمام علماء کرام ایسے ہی تھے، جیسے یہ مولوی صاحب؟ آپ نے ایک فرد کے کردار کی بنیاد پر مذہب کے بارے میں رائے قائم کرلی، خود مذہب کا براہِ راست مطالعہ کیوں نہ کیا؟ اس پر انہوں نے یہ شکوہ کیا، اور میرے نزدیک یہ شکوہ بجا نہ تھا کہ دیوبند اور دینی تعلیم کے دیگر مراکز نے بنگال، آسام پنجاب سندھ صوبہ سرحد اور دور دراز کے دیگر مقامات مثلاً برما تک تو علماء کو بھیجا اور مسلمانوں کے لئے دینی تعلیم کا انتظام کیا مگر بلوچستان کو یکسر نظر انداز کیا۔ وہاں تبلیغی جماعت نے بھی کوئی توجہ نہ دی اس لئے اسلام کی تعلیمات روایتاً تو ہماری تہذیب میں رچی بسی رہیں اور وہ ہمارے کلچر کا حصہ بنا رہا، لیکن ہمعصر دنیا کے مسائل سے متعلق اس کا تازہ لٹریچر یہاں نہ پہنچ سکا؟ میرے پاس جیل میں جب ہائی کورٹ کے حکم پر تفہیم القرآن کی جلدیں اور کچھ دوسری کتابیں پہنچیں تو میں نے شیر محمد مری کو تفہیم القرآن کی پہلی جلد پیش کی اور ان سے کہا کہ وہ اس کا مقدمہ پڑھیں اور صبح اس پر اظہار خیال فرمائیں۔ انہوں نے ہنس کر کہا کہ تم نے مجھے پھانسنے کا یہ اچھا طریقہ اختیار کیا ہے، میں نے جواباً کہا کہ آپ مجھے پھانسنے کے لئے اپنی پسند کی کوئی کتاب عنایت فرمادیجئے، میں اس کا مطالعہ کرکے اپنی رائے دے دوں گا، انہوں نے اس پیشکش پر لینن کی ایک کتاب میرے حوالہ کی، جس کا موضوع تھا، اشتراکی انقلاب کیسے برپا ہوتا ہے۔ تفہیم القرآن کا مقدمہ انہوں نے تین دن میں ختم کیا اور اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مولانا مودودیؒ کا میں نے نام تو سنا تھا لیکن ان کی کوئی تحریر نظر سے کبھی نہیں گزری، بس اخبار میں ان کے بیانات پڑھتا رہا ہوں، یہ پہلی تحریر ہے جو میرے مطالعہ میں آئی ہے۔ ان کے قلم میں واقعی جادو ہے، زبان بہت اثر انگیز اور دلائل وزنی ہیں، وہ اس کے

ادبی محاسن کو سراہتے رہے، میں نے کہا کہ جس کتاب کا یہ مقدمہ ہے، اب اسے بھی تو دیکھئے اور ذرا آگے چلیئے، مگر وہ مقدمہ سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اشتراکیت کا گہرا نشہ اس راہ میں حائل ہو گیا مگر ہمارے درمیان سلسلہ کلام کبھی منقطع نہ ہوا وہ کسی مسئلہ پر مثلاً فلسفۂ قومیت پر اشتراکی فکر کے حوالے سے گفتگو کرتے اور میں دینی نقطۂ نظر سے اس پر اظہار خیال کرتا، میرا سوال یہ بھی ہوتا کہ اگر اشتراکیت ایک عالمگیر فکر ہے اور اس کے دائرے میں مختلف قومیتیں مل کر ایک قوم بن جاتی ہیں جیسے روسی یا چینی قوم تو پھر برصغیر کے مسلمان ایک عقیدے اور فکر کی بنیاد پر مختلف زبانوں، علاقوں اور ثقافتوں کے باوجود ایک قوم کیوں نہیں بن سکتے؟ ان کے نزدیک مذہب زندگی کا ایک جزو تھا اور اشتراکیت ایک مکمل ضابطۂ حیات [illegible]۔ میرے نزدیک اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات تھا۔ معاشی نظام سمیت زندگی کا ہر پہلو اس کا ایک جزو۔ ہمارے درمیان زیادہ تر بحث قومیت ہی کے مسئلہ پر ہوتی، وہ بہر حال مذہب کو قومیت کی بنیاد تسلیم کرنے پر کسی طرح آمادہ نہ ہوئے۔

شیر محمد مری موڈ میں ہوتے، تو اپنی زندگی کے دلچسپ واقعات بھی سناتے، انہوں نے دنیا کے مختلف ممالک کا سفر کیا تھا، مشرقی جرمنی میں کے جی بی کے مراکز میں گوریلا جنگ کی تربیت حاصل کی تھی اور ''جنرل شیروف'' کا خطاب بھی وہیں سے حاصل کیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ ایک بار مغربی جرمنی کے شہر فرنیکفرٹ میں، میں کسی راستے سے گزر رہا تھا کہ چند لڑکیاں پیچھے لگ گئیں، بعض کے ہاتھ میں کیمرے بھی تھے، ان میں سے ایک نے قریب آکر کہا کہ آپ کی شخصیت ہمارے لئے ایک عجوبہ ہے، ہم آپ کی تصویر بنانا چاہتے ہیں۔ اس طرح کہ آپ ہم میں سے کسی کو کس (Kiss) کرتے دکھائی دیں، میں نے انہیں ڈانٹ پلائی اور تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔ انہوں نے دور ہی سے میری چند تصویریں بنا کر اپنا شوق پورا کیا، ایک بار راہ چلتے ایک شخص قریب آیا اور مجھ سے کہا کہ میں آپ کی ایک اچھی سی تصویر کسی اسٹوڈیو میں بنانا چاہتا ہوں، میں نے پوچھا کس لئے؟ اس نے جواب دیا کہ شراب کی بوتلوں پر لیبل کے لئے آپ کی تصویر بہت جاذب نظر ہوگی۔ میں ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی کا نمائندہ ہوں، آپ کو اس کا بہترین معاوضہ دوں گا، میں نے غضبناک ہو کر کہا کہ تمہیں اس کی جرات کیسے ہوئی؟ وہ میری آواز اور تیور دیکھ کر بگٹٹ بھاگا اور پلٹ پلٹ کر یہ دیکھتا جاتا تھا کہ کہیں میں اس کا تعاقب تو نہیں کر رہا۔

بھٹو دور میں کلفٹن کراچی میں واقع ایک تحقیقاتی سیل میں پوچھ گچھ کی روداد سناتے

ہوئے بتایا کہ مجھے ۸ جون تک ۲۴ گھنٹے انتہائی تیز لائٹ کی زد میں رکھا گیا اور سونے نہ دیا گیا، تحقیقاتی افسر اپنی مرضی کے مطابق کچھ اگلوانا چاہتا تھا، جب ناکام ہوا تو مجھ سے مخاطب ہو کر بولا کہ مجھے بھٹو صاحب کی طرف سے جن کارروائیوں کی اجازت دی گئی ہے ان میں آپ کو آختہ (Castrate) کرنا بھی شامل ہے، اس پر میں نے کہا کہ میری مردانگی سے انہیں کیا تکلیف پہنچ رہی ہے؟ اور اس کے ساتھ ہی شیر محمد مری نے مزید جو کچھ کہا وہ دلچسپ تو ہے مگر قابل تحریر نہیں۔

انہوں نے بتایا کہ اکبر بگٹی جب گورنر بلوچستان تھے تو بھٹو نے انہیں پیغام بھیجا کہ ہم کوہلو میں مقید چوہدری ظہور الٰہی کو کراچی سینٹرل جیل میں منتقلی کے لئے جیپ میں سوار کر کے کوئٹہ لائیں گے تم پہاڑوں کے درمیان راستے ہی میں ان کا کہیں کام تمام کرادو۔ بگٹی صاحب نے جواب دیا کہ ہم بلوچ کبھی اس طرح کی بزدلانہ کارروائی نہیں کرتے، اپنے دشمن کو بھی للکار کر حملہ کرتے ہیں، بلوچستان کی حدود میں ایسی کوئی حرکت ممکن نہیں۔ شیر محمد مری ہمارے ساتھ سول اسپتال بھی جایا کرتے تھے، جہاں ڈاکٹر ادیب الحسن رضوی ان کا معائنہ کرتے، وہ گردے کی تکلیف میں مبتلا تھے، جب وہ ساتھ ہوتے تو پولیس کی نفری اور آگے پیچھے گاڑیوں میں مسلح گارڈز کی تعداد معمول سے دوگنا ہو جاتی، پولیس پر ایک خوف سا طاری رہتا اور واپسی پر جیل کے دروازے پر پہنچتے ہی پولیس افسران اور سپاہی اطمینان کا سانس لیتے، خدا کا شکر ادا کرتے۔ جیل میں شیر محمد مری نے ہمیں سبی اور بلوچستان کی دوسری چیزیں جن میں کھجوریں بھی شامل تھیں، کھلائیں اور رہائی کے بعد کوہلو آنے کی دعوت دی، لیکن جیل سے نکلنے کے بعد ان سے ملاقات کی نوبت نہ آسکی۔ البتہ وہ کبھی کبھار کوئی تحفہ ارسال کرتے اور اپنا سلام بھیجے۔ وہ عقائد و افکار اور اعمال و اطوار کے لحاظ سے جو کچھ بھی ہوں لیکن تھے ایک منفرد اور بے مثال شخصیت کے مالک۔

شیر محمد مری عقیدتاً کچھ بھی ہوں، مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ نام کا ایک جزو ''محمد'' بھی ہے، بلوچستان میں دینی تعلیم کے فقدان کا احساس و اظہار ان کے اندر چھپے ہوئے مسلمان کی زندگی کا ثبوت مہیا کرتا ہے، ان سے دوستی اور رفاقت کا تقاضا ہے کہ میں ان کے حق میں یہ دعا کروں کہ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

(ہفت روزہ تکبیر کراچی ۲۷ مئی ۱۹۹۳ء)

عوام انقلاب اور قومیں آزادی چاہتی ہیں!

(جنرل شیروف کی ایک یادگار تقریر)

میرے بھائیو اور بہنوں!

سب سے پہلے میں آپ سے ایک گزارش کرونگا وہ یہ کہ میری تقریر کے دوران اگر آپ نعرہ وغیرہ نہ لگائیں تو میں آپ کا ممنوں رہوں گا، کیونکہ میں نے اپنی زندگی میں کبھی نعرہ بازی نہیں کی۔ نعرے سنے ضرور ہیں۔ میں ذاتی طور پر ایک عملی آدمی رہا ہوں اور عمل کرنے پر ہی یقین رکھتا ہوں، اس لئے مجھے توقع ہے کہ آپ لوگ میری اس گزارش کو ضرور قبول فرمائینگے اور نعرہ بازی سے گریز کرینگے، ویسے بھی نعرہ بازی اس ملک میں ایک روایت بن کر رہ گئی ہے بلکہ یہ ملک خود ہی ایک بڑا نعرہ بن گیا ہے۔ میں سندھی میں بات کرسکتا ہوں، (جنرل شیروف سندھی میں بولنا کرنا شروع کردیتے ہیں) لیکن افسوس ہے کہ میں سندھی زبان میں اپنے جذبات اور نظریات کی صحیح ترجمانی نہیں کرسکتا۔ میں سب سے پہلے آپ تمام لوگوں کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے ایک موقعہ فراہم کیا ہے تاکہ میں شاہ لطیف اور ہوشو کی سرزمین پر آپ سے مخاطب ہوسکوں، آپ کو شاید میری اس تقریر سے مایوسی ہو کیونکہ میں آپ کے سامنے کوئی جذباتی تقریر نہیں کروں گا کیونکہ میں زندگی میں عملی انسان رہا ہوں، عمل سے ہی منزل ملتی ہے اور انقلاب کبھی نعروں سے نہیں آتے۔ میں اپنی تقریر کی شروعات شاہ لطیف بھٹائی کی اس دعا سے کرتا ہوں۔

سائیم سدائیں کریں متھے سندھ سرکار

دوست مٹھا دلدار عالم سبھ آباد کریں!

اس کے بعد میں آپکو ایک دوسری بات بھی سناؤں کہ یہ پنجابی حکمران، سندھیوں اور بلوچوں کو پتہ نہیں کیا سمجھتے ہیں، اس لئے میں انہیں بھی تاریخ کا ایک سبق اور ایک راستہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ۔ ''مرسوں مرسوں سندھ نہ ڈیسوں'' (مرجائینگے لیکن سندھ کسی کے حوالے نہیں کرینگے)

ابھی میں اپنی تقریر جسے میں نے کہا کہ اردو میں کرونگا کیونکہ میں اپنے مؤقف کی صحیح ترجمانی کسی اور زبان میں نہیں کرسکتا، حضرات! مجھ سے پہلے آپ کے سامنے کئی نوجوانوں نے اپنی تقریریں اور اظہار خیال کیا ہے، جیسے کہ روایت چلتی آئی ہے کہ یہ ملک مردہ پرستوں کا ملک ہے اس

Scanned with CamScanner

لئے اس ملک کی تقدیر میں رونا دھونا اور ماتم کرنا لکھا ہے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ گذشتہ 40۔ برس سے جو ظلم، جبر اور قتل عام ہوا ہے جتنا خون خرابہ ہوا ہے اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی، یہ ایک نا قابل فراموش حقیقت ہے۔ اس کو دہرانے سے اس کے اسباب ختم نہیں ہو سکتے جب تک آپ ان واقعات کے اسباب معلوم نہیں کر لیتے۔ ان حالات کا تجزیہ نہیں کر لیتے جو ایسے جرائم کو جنم دیتے ہیں تب تک آپ ان واقعات کو ہونے سے نہیں روک سکتے اور ہمیشہ روکنے سے قاصر رہینگے۔ ہم نے اس سے پہلے بھی کہا ہے کہ مذہب کے نام پر دنیا میں نہ کبھی کوئی تھیوکرسی ریاست بنی ہے اور نہ ہی بن سکتی ہے۔ شاید آپ تھک چکے ہیں ورنہ دل چاہتا ہے کہ میں ایک لمبی تقریر کروں جس میں دل کھول کر اس ملک میں ہونے والے مظالم کی ایک لمبی داستاں بیان کروں لیکن مجھے آپ کے وقت احساس ہے۔

آیئے تو سب سے پہلے اس بات کا تجزیہ کریں کہ پاکستان جس کو ایک مکمل ریاست کہا جاتا ہے، جسکو وجود میں آنے والی ریاست کہا جاتا ہے دیکھیں کہ اس کو ریاست کیوں کہا جارہا ہے اور ریاست کا وجود کیسے عمل میں آتا ہے؟ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جب کسی خطے کے تضادات نا قابل حل ہو جاتے ہیں، یا تصادم والی شکل اختیار کرتے ہیں تب ایک استحصالی طبقہ یا لوٹ مار کرنے والا طبقہ ریاست کو وجود میں لاتا ہے تا کہ ان متصادم تضادات کو معتدل اور ٹھنڈا کیا جاسکے، اس کے لیے وہ کبھی مذہب کا نام لیتا ہے، کبھی لمبے کالے چغے پہن کر عدالتوں میں نعرہ بازی کرتے ہیں ہے اور کبھی ملک اور ملت کی سالمیت کے نام پر قتل عام کرتے ہیں، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا 1947ء سے قبل یہ تضادات موجود تھے؟ جب یہ ریاست وجود میں آئی۔ میں آپکو یقین سے کہتا ہوں کہ 1947ء سے قبل ایسی کوئی بات نہیں تھی، ایسے تضادات موجود نہ تھے۔ میں اس وقت جیل میں تھا اور مجھ پر غداری کا الزام تھا، جب پاکستان وجود میں آیا تو میں نے اس کا پرچم جیل میں دیکھا تھا۔ مجھے فخر ہے کہ میں اس حوالہ سے آج بھی وہی غدار ہوں، میرے اس ٹائیٹل میں آج تک کوئی فرق نہیں آیا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب تضادات ہی متصادم نہ تھے کیونکہ پاکستان کی ریاست اور اس کی تشکیل اور اس کی ریاستی مشنری اور افسر شاہی اور آرمی، اور اس کی عدلیہ ہر چیز انگریزوں کی پیدا کردہ ہے، صرف اس کا نام پاکستان رکھ دیا گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ جب ایک ریاست نے وہاں کے تضادات سے جنم نہیں لیا تو پھر اسی ریاست کا حکمران اور استحصالی طبقہ اس سرزمین کے تضادات کو کیونکر سمجھ پائے گا؟ اور کس طرح ان مسائل کو حل کر سکے گا؟ دراصل یہاں کے حکمرانوں کا المیہ یہ ہے جو گذشتہ چالیس برسوں سے چلتا آ رہا ہے اور چلتا رہے گا۔

جیسا کہ میں نے شروع میں کہا کہ پاکستان اور دنیا کی کوئی بھی ریاست کسی ایک طبقہ کی ہوتی ہے، جملہ طبقات کی مشترکہ ریاست نہیں ہوتی۔ ایک سوشلسٹ ریاست عوام کی ہوتی ہے اور

Scanned with CamScanner

، مزدور طبقہ کی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ایک جاگیردارانہ ریاست، جیسا کہ پاکستان ہے، جاگیرداروں کی ریاست ہوتی ہے، چنانچہ یہ ریاست اس ملک کے عوام کی ریاست نہیں ہے۔ کوئی بھی ریاست ہو، جب تک اس ریاست میں موجود بنیادی تضادات کو ڈھونڈ نہیں لیا جاتا تب تک آپ کچھ نہیں کر سکتے، سوائے نعرہ بازی کرنے کے۔ میں نے پہلے بھی کہا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اس ملک کا بنیادی تضاد، قومیتوں کا تضاد ہے، لیکن ہماری آواز کو نظریہ پاکستان (جس کا کوئی وجود نہیں) کے نام پر بڑی بے رحمی اور سفاکی سے کچلا گیا ہے۔ ہم نے ان لوگوں سے اس حوالہ سے پوچھا اور نتیجہ میں عمر بھر جیلوں میں بند رہا۔ الزام یہ لگایا گیا کہ آپ لوگ نظریہ پاکستان کے مخالف ہو۔ ہم نے کہا کہ ہمیں بتایا جائے کہ نظریہ پاکستان کا مطلب کیا ہے؟ لیکن سامنے کوئی بھی جواب نہ تھا، تاہم ہم نے انہیں جواب دیا اور بتایا کہ جناب آپ جو بات کر رہے ہیں اس کا خود آپکو کوئی پتہ نہیں ہے۔ لیکن ہمیں پتہ ہے کہ نظریہ پاکستان کی معنی اور مطلب کیا ہے۔ عملی طور پر جو کچھ ہوا ہے اس کے لیے مجھ جیسا آدمی جو ایک مخصوص فکر اور نظریہ سے وابستہ ہے، اس بنیاد پر یہ تجزیہ نہیں کرتا کہ ایک فرد، ایک گروپ یا اجتماع کی کیا سوچ ہے اور وہ کیوں اور کس کے لیے سوچتا ہے۔ میں اس بنیاد پر تجزیہ نہیں کیا کرتا کیونکہ جس کو آپ نظریہ پاکستان کہتے ہیں، اس کا مطلب ہے کہ اس ملک میں بسنے والی قومیتوں کی قومی زبان، ان کی ثقافت، ان کی تاریخ، ان کی رسومات، ان کی شرافت اور ان کے جملہ انسانی اقدار کو تباہ و برباد کر کے انہیں بالکل ختم کر دیا جائے۔ آپ کو مجھ سے اس بات پر اتفاق کرنا پڑے گا کہ گذشتہ چالیس برسوں میں یہی کچھ ہوا ہے۔ علاوہ ازیں یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہمارے کچھ دوستوں کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہ تھا، چنانچہ ان میں سے بیشتر نے صرف قومیت کا نعرہ لگایا اور کچھ نے سوشلزم کا نعرہ لگایا، میں سمجھتا ہوں کہ دونوں ہی مخلص نہ تھے، کیونکہ جو صرف قومیتوں کی بات کرتا ہے وہ فاشسٹ ہے، اور جو صرف پرولتاریہ کی بات کرتا ہے وہ ٹریڈ یونینسٹ تو ہے لیکن ایک انقلابی یا مارکسسٹ نہیں ہے۔

آج یہ تاریخ کا ایک رجحان ہی نہیں بلکہ ایک فیصلہ ہے کہ ''قومیتیں آزادی چاہتی ہیں اور عوام انقلاب چاہتا ہے۔'' چنانچہ ان دونوں کو ساتھ لے کر چلنا پڑیگا کیونکہ اگر آپ مزدور، کسان اور عوام کو اپنی جدوجہد میں ساتھ لے کر نہیں چلیں گے تو پھر انقلاب کون لائے گا؟ فوجی جنرل انقلاب نہیں لاتے اور نہ ہی یہ عوامی لیڈر انقلاب لاتے ہیں۔

ہم چھوٹی قومیتوں، خصوصی طور پر بلوچ اور سندھیوں کا بڑی بے رحمی اور بے شرمی سے استحصال کیا گیا ہے اس حد تک کہ ہمارے قومی وجود کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ ہماری تاریخ کا مذاق اڑایا گیا اور ہماری ثقافت کو دفن کرنے کی ناپاک کوششیں بھی کی گئیں۔ یہاں تک کہ ہم سے ہماری دھرتی کو چھیننے کی کوشش بھی کی گئی۔ لیکن میں ان قوم پرست اور عوام دوست شہداء کو سلام پیش

کرتا ہوں جنہوں نے اس جبر اور استحصال کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ جس کے نتیجہ میں آپ کم از کم قومیت کی بات تو کر سکتے ہیں۔ یہ تو ہمیں پتہ ہے کہ قومیت کی بات کرنا کتنا بڑا گناہ سمجھا جاتا تھا اور ہم نے اس کے پاداش میں کیا کچھ نہیں بھگتا۔ آج مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہو رہی ہے کہ کم از کم نعرہ بازی کی حد تک تو آزادی حاصل ہے، جبکہ ہمیں اتنی آزادی بھی حاصل نہ تھی۔ چنانچہ ہم کمروں میں چھپ کر ایسی باتیں کیا کرتے تھے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سامراج اور اس کے مقامی دلال سے سب سے پہلے بلوچ عوام نے ہی بھرپور مقابلہ کیا ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے، جس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ یہاں ایک دوست نے بلوچ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے نمائندہ کو ایک پرچی لکھی ہے جس کا جواب میں دیتا ہوں، کیونکہ میں آپ سب کے سامنے ہوں اور اس جنگ (بلوچستان کی) کا ایک کردار ہوں۔ میں 1973ء سے 1978ء تک جیل میں تھا اور مجھ کو کوئی سزا بھی نہیں سنائی گئی تھی اس کے باوجود میں جیل میں تھا۔ اس سے پہلے بلوچستان میں پانچ ڈویژن ریگولر آرمی نے عوام کا آپریشن کیا تھا جس میں ہماری ماؤں اور بہنوں کی عصمت دری کی گئی، ہماری اولاد کو مارا گیا اور ہمارے اربوں روپوں کی مالیت کے مویشیوں کو لوٹا گیا۔ میں آپ کے سامنے کھڑا ہو کر یہ بات کر رہا ہوں اور آپ اس سے ایک عام بلوچ کی دیانتداری کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ بلوچوں کے ساتھ اس قدر ناروا سلوک کیا گیا کہ ان کی معصوم بیٹیوں کو بازار میں فروخت کیا گیا اور میں آپکو آج بھی وہ لوگ دکھانے کو تیار ہوں جنہوں نے اپنی معصوم بیٹیاں فروخت کی تھیں اور انہیں خریدا گیا تھا۔ میں آج بھی ان معصوم بیٹیوں کو، انہیں فروخت کرنے اور خریدنے والوں کو پریس کے سامنے لانے کے لئے تیار ہوں۔ اور یہ میرا چیلنج ہے کہ وہ لوگ ہم سے معافی مانگیں، ہمیں تو کسی سے بھی کوئی نفرت نہیں۔ ہم تو ایک محبت کی دنیا بنانا چاہتے ہیں، ایک انسان دوستی کی دنیا بنانا چاہتے ہیں۔ البتہ جو کوئی بھی ہماری قومیت پر ڈاکہ زنی کرے گا اور ہمارے غریب عوام کا خون چوسے گا، ہم اس سے شدید نفرت کریں گے اور وہی ہمارا بدترین دشمن ہے۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے آخر اس کا علاج کیا ہے؟ جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ قومیتوں کا تضاد ہی اس ملک کا بنیادی تضاد ہے اور بقیہ تضادات اس کے گرد گھوم رہے ہیں۔

مذہبی ریاست نہ کبھی ہوئی ہے اور نہ ہی ہوگی۔ کم از کم اس خط میں ''ملا شاہی'' نہیں چل سکتی۔ یہاں سختیاں اور گولیاں تو چل سکتی ہیں لیکن ''مُلا شاہی'' نہیں چل سکتی۔ جب سے پاکستان قائم ہوا ہے، سندھیوں، بلوچوں اور پختونوں کو ڈی کلچر اور ڈی نیشنلائیز ڈ کرنے کے لیے بہت ترغیبیں دی گئی ہیں۔ دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ قوموں کو ڈی کلچر صرف دو قوتیں کرتی ہیں۔ ایک مذہب اور دوسرا دھرتی۔ میں ایک بلوچ ہوں اور میرے بلوچ بھائیوں نے سندھ پر حکومت کی

ہے لیکن سندھ کی دھرتی اور دریائے سندھ کے پانی نے انہیں ڈی کلچر کر دیا اور وہ سندھی بن گئے۔لیکن ان لوگوں نے سندھیوں، بلوچوں اور پختونوں کو مذہب کے نام پر ڈی کلچر اور ڈی نیشنلائیز ڈ کرنا شروع کر دیا ہے، ہماری زبانوں کو طعنہ زنی کا نشانہ بنایا گیا ہے، جبکہ ہماری زبانوں کی جڑیں اس دھرتی میں ہیں اور ہمارے کلچر کی جڑیں بھی اس سرزمین سے منسلک ہیں اور ہماری تاریخ سے وابستہ ہیں لیکن چونکہ طاقت اور اختیار ان لوگوں کے ہاتھوں میں تھا، چنانچہ وہ سب کچھ کرتے رہے۔لیکن ہم نے بھی ہار نہیں مانی اور معافی طلب نہیں کی۔ ہماری بلوچ قوم میں صدیوں پہلے بالاچ نامی ایک گوریلا موجود تھا جو ایک بلوچ قومی شاعر بھی تھا، اس نے اپنے دشمنوں کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ تم سے مفاہمت صرف اس صورت میں ہو سکتی ہے جب سانپ اڑتے نظر آئیں گے۔تم سے دوستی فقط تب ہو سکتی ہے جب ہاتھوں کے اوپر بال اگنا شروع ہوں گے، اور تم سے فیصلہ تب ہی ہو سکے گا جب ہرن کے بالوں کو بھیڑ کے بالوں کی طرح کاٹ کر بازار میں فروخت کیا جا سکے گا۔ہم نے بھی سو فیصد اس بات پر عمل کیا ہے۔

میرے بھائیو! بات یہ ہے کہ اس ملک میں کچھ لوگ ہمیں جنگجو اور جنگ پسند کہتے ہیں، جبکہ جنگ ہمیشہ طاقتور گروہ کی ہی چاہت ہوتی ہے اور کمزور ہمیشہ بات چیت اور صلح پسندی ہی چاہتا ہے۔سندھی، بلوچ اور پختون طاقتور نہیں کہ وہ جنگ کے خواہشمند ہوں، لیکن ایک بات ضرور ہے اور وہ یہ کہ گولی، گولی کو ہی جنم دیتی ہے۔ چنانچہ اگر آپ ہم پر گولی چلائیں گے تو پھولوں کے ہار ہم بھی آپکو نہیں پہنائیں گے۔ہم یہ صرف بات نہیں کرتے بلکہ ہم نے یہ کر کے بھی دکھایا ہے۔

بھائیو! ہم بالکل جنگجو نہیں ہم انسان دوستی چاہتے ہیں، ہمیں تو انسانیت سے پیار ہے لیکن اگر کوئی ہم پر جنگ مسلط کرے گا، پھر وہ غداری کے الزام کے تحت ہو یا ملک دشمنی کے ہم جنگ کا جواب جنگ ہی سے دیں گے اور پیار کا جواب پیار سے دیں گے۔ چنانچہ ہم کہتے ہیں کہ یہ قومی جبر اور لوٹ مار ختم کرو۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ جب تک مظلوم قوم کا استحصال اور لوٹ مار جاری رہے گی تب تک آپ کوئی انقلاب نہیں لا سکتے اور اس طرح انقلاب نہیں آئے گا۔

ہمارے جو ترقی پسند اور پروگریسو بھائی ہیں یا جو سوشلسٹ وڈیرے ہیں اور جو کسی کو شاؤنسٹ اور کسی کو بنیاد پرست کہتے ہیں، میں ان سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا جس فلسفہ اور نظریہ میں آپ کا یقین ہے اور جس کے لیے آپ بڑے دعوے کرتے پھر رہے ہیں اس میں یہ نہیں بتایا گیا کہ مظلوم قومیتوں کی قومی جدو جہد بذات خود ایک طبقاتی جدو جہد ہے، کیونکہ قومی استحصال ایک ایسی چیز ہے جس کے توسط سے ہر ایک کو لوٹا جاتا ہے۔

میرے دوستو! اس ملک میں ہم صرف چار قومیتیں ہیں، چنانچہ یہ ایک سیدھی بات ہے کہ یہاں کوئی بھی مسلمان قوم یا پاکستانی قوم نہیں، بلکہ یہاں سندھی، بلوچ، پختون اور پنجابی قومیتیں ہی ہیں۔

Scanned with CamScanner

مسلمان نام کی کوئی بھی قوم نہیں، مسلمان ایک دین ہے، ایک ملت ہے۔ مذہب کا تعلق ہمیشہ خدا اور بندہ کے بیچ میں ہوتا ہے، جنرلوں کے بیچ میں نہیں۔ انہیں کوئی حق نہیں کہ وہ خدا کی جانب سے وکیل بن کر آئیں۔

اس ملک میں نفرت کی دیواریں ہم نے کھڑی نہیں کیں۔ سندھیوں نے نفرت پیدا نہیں کی، بلوچ نے نفرت کا بیج نہیں بویا، بلکہ ظالم تو وہ ہے جس نے انہیں لوٹ کر غریب ترین بنا دیا ہے۔ چنانچہ نفرت کا بیج ان لوگوں نے ہی بویا ہے اور اب نفرت کی دیواریں اس قدر اونچی ہو گئیں ہیں کہ اس ملک میں بسنے والی چار قومیتیں بھی ایک دوسرے کی آواز سننے کے لیے تیار نہیں۔ کہنے کا مطلب ہے کہ ہم اکٹھے جدوجہد کس طرح کر سکتے ہیں جبکہ ہمارے درمیان نفرتوں کی دیواریں اس قدر اونچی ہو چکی ہیں کہ ہمیں ایک دوسرے کی آواز بھی پسند نہیں ہے۔ ہم چھوٹی اور مظلوم قومیتوں کو پچھلے چالیس برسوں میں جیل، گولی، پھانسی، اپنی ماؤں اور بہنوں کی عصمت دری اور اپنی دھرتی کی لوٹ مار کے سوا کچھ نہیں ملا۔ جو لوگ پاکستان کو قائم رکھنا چاہتے ہیں اور جو پاکستان کے مالک بننا چاہتے ہیں، ان لوگوں نے تو ہمیں اس میں سے ذرا سا بھی حصہ نہیں دیا۔

اس کے علاوہ اس جلسے میں کچھ دیر قبل کچھ دوست قرارداد منظور کروا رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ ''منظور ہے یا نا منظور ہے'' مجھے پوری طرح نہیں پتہ کہ وہ کیا فرما رہے تھے، لیکن میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ عمل انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ آپ کیا مطالبات پیش کر رہے ہیں اور کس سے مطالبات کر رہے ہیں؟؟ یہ تو ایسا ہے جیسے کوئی مقتول قاتل کو کہہ رہا ہو کہ مجھے معاف کرو۔ آجکل بڑا بھائی چاہے پاگل ہو یا ہیروئن پیتا ہو لیکن چھوٹے بھائی کو برابر کا درجہ دینے کے لیے تیار نہیں ہے اور کہتا ہے کہ تم چھوٹے بھائی ہو جیسا کہ فارسی کا ایک مقولہ ہے: ''سگ باش برادر مواش'' کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کیا آپ کو آپ کے حقوق صرف مطالبات کرنے سے مل جائیں گے؟ دنیا میں آج تک ایسی کوئی مثال نہیں اور کبھی بھی ایسا نہیں ہوا، کیونکہ یہ انسانی فطرت کے خلاف ہے، ایک تباہ شدہ اور لوٹ مار کا شکار ہونے والی قوم کو مطالبات سے حقوق مل جائیں۔ یہ ناممکن ہے، بلکہ انسانی مزاج کے ہی برعکس ہے۔

ایک جانب جی تھری رائیفل ہے اور دوسرے طرف آپ اسے ایک کاغذ کے ٹکڑے سے بیکار بنانے کی کوشش کر رہے ہیں! یہ ناممکن ہے۔ بات سیدھی سی ہے کہ اب ہمارے پاس گنوانے کے لیے کچھ بھی نہیں بچا۔ چنانچہ ہمیں کوئی خوف نہیں ہے، لیکن اگر آپکو پاکستان کو قائم رکھنا ہے تو پھر آپکو چار قومیتوں کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ ان کے قومی تشخص، قومی وجود، قومی تاریخ اور ان کے قومی حقوق کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ آپ قومی صوبے قائم کریں۔ پہلے قومی خود مختاری اور بعد میں صوبائی خود مختاری دیں پھر عام انتخابات کرائیں اور مرکز میں مساوی درجہ دیں، ہر ایک قومی صوبہ کو اپنی علیحدہ

قومی فوج رکھنے کے اختیارات دیئے جائیں۔ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ ہم صبح کو نیند سے بیدار ہی نہ ہوں کہ کسی ایک نے راولپنڈی سے بوٹ پالش کرلی اور سارے ملک کو فتح کرڈالا۔مارشل لا کو صرف اور صرف ہر ایک قوم کی ایک قومی فوج ہی روک سکتی ہے،اور کوئی نہیں روک سکتا۔جونیجو کا پانچ نکاتی پروگرام اسے نہیں روک سکتا۔جونیجو صاحب اور دوسرے لوگ یہ کہتے ہیں کہ اب مارشل لا نہیں آئے گا۔بھائی آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ تخلیق خالق کے مقابل ہو رہی ہے؟ آپ کس چیز کی پیداوار ہیں؟ دنیا میں ایسی کوئی مثال موجود ہے کہ تخلیق اپنے خالق کا مقابلہ کرنے چلی ہو؟ اس کے باوجود بھی اگر تخلیق خالق کا سامنا کرے گی تو خالق اسے کیا سے کیا بنادیگا بلکہ اس کا حلیہ ہی بگاڑ دے گا۔

بات بالکل واضح ہے کہ ہم اب بہت کچھ گنوا چکے ہیں اگر آپ ہمارے اس مطالبہ کو تسلیم نہیں کرتے تو پھر ہم جانتے ہیں کہ حقوق مانگے نہیں جاتے بلکہ چھین لیئے جاتے ہیں۔تاہم چالیس برسوں سے چھوٹی قومیتوں خصوصی طور پر سندھیوں اور بلوچوں نے اپنا دامن پھیلا رکھا ہے، واسطے دیے ہیں، اپنے بیٹوں کو شہید کرایا ہے۔ہم نے کیا کچھ نہیں کیا؟ ان چالیس برسوں میں اگر ہم کسی آہنی دیوار سے ٹکراتے تو شاید وہ بھی ٹوٹ جاتی لیکن یہاں تو معاملہ بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے، چنانچہ اب ہماری جانب سے کوئی بھی مطالبہ نہیں ہے۔ہم اپنے حقوق چھین کرلیں گے، میں یہ بات علی الاعلان کہہ رہا ہوں چاہے قانون اسے پسند کرے یا نہ کرے کم از کم سندھی اور بلوچ دو ایسی قومتیں ہیں جو نہ صرف مظلوم ہیں بلکہ وہ غلام قومیں بھی ہیں چنانچہ ہمیں اپنی غلامی کو تسلیم کرنا چاہیئے، کیونکہ جو قوم اپنی غلامی کو تسلیم کرتی ہے اسے دنیا کی کوئی بھی طاقت آزادی سے نہیں روک سکتی۔لیکن جو قوم غلام ہوتے ہوئے بھی خود کو دھوکہ میں رکھتی ہو اس کا وہی حشر ہوتا ہے جو آجکل ہمارا ہو رہا ہے۔ ہمیں اب فخر ہے کہ ہم نے اپنی غلامی کو محسوس کرلیا ہے، اب کوئی بھی ہمیں زیادہ دیر تک غلام نہیں رکھ سکتا۔چنانچہ اب ہمیں اپنے قومی حقوق دیدو۔ہم چاہیں یا نہ چاہیں، تاریخ کو اپنا راستہ ڈھونڈنا ہے اور وہ اسے ڈھونڈ لے گی۔تاریخ ایک بار اپنے راستہ پر گامزن ہو چکی ہے اور اسے کوئی بھی نہیں روک سکتا لیکن ہمیں پتہ ہے کہ ان لوگوں کے دماغ کے اوپر پردہ پڑا ہوا ہے جو تاریخ سے سبق حاصل نہیں کرتے، الٹا تاریخ کو سبق سکھانا چاہتے ہیں، اور پھر جب تاریخ کا تھپڑ لگتا ہے تو پھر نہ ''اُما کمیٹی رہتی ہے نہ ہی اما کمیٹی'' دونوں یکساں ہو جاتی ہیں۔ہمدردی، انسانیت اور اسلام کے نام پر لاکھوں کی تعداد میں افغانستان سے بھاگے ہوئے ہیروئن فروشوں کو ملا شاہی کی نیابت میں اول تو سرحد اور بلوچستان میں ٹھہرایا گیا، لیکن جب وہاں وسائل کم ہونے لگے تو انہیں آپ لوگوں کی جانب (سندھ) بھیجا جانے لگا اور اب وہ دھڑا دھڑ آپ کے یہاں آرہے ہیں۔سندھ میں آرہے ہیں اور کراچی میں بسنے لگے ہیں۔صرف چار سال پہلے آپ ہیروئن کے نام سے بھی شاید واقف نہ تھے لیکن آج آپ کا ملک ہیروئن کے حوالہ سے پہچانا جاتا ہے، پاکستان کے نام سے اس کی شناخت

Scanned with CamScanner

نہیں۔ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر تمہیں (اقتدار کے مسند نشینوں کو) ان افغان بھگوڑوں سے اتنی ہی انسانی ہمدردی ہے اور تمہیں اسلام کا اتنا ہی درد اور شوق ہے تو پھر انہیں اپنے پاس کیوں نہیں ٹھہراتے؟ سندھ، بلوچستان اور پختونستان میں کیوں بساتے ہو؟

بلوچستان کی صورتحال یہ ہے کہ وہاں بائیس فوجی چھاؤنیاں قائم ہیں۔ہم ان سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ جناب ہمیں یہ بتایئے اور اپنے عوام کو اعتماد میں لیجئے کہ گوادر میں کیا ہو رہا ہے؟ جیونی میں کیا ہو رہا ہے؟ پسنی میں کیا ہو رہا ہے؟ اور ماڑا کے پہاڑ میں آپ نے جو سوراخ کر کے فوجی چھاؤنی بنائی ہے اس میں کیا رکھا ہے؟ پچھ میں کیا ہو رہا ہے؟ راسکو، ہوشاب، ضدق میں کیا کچھ ہو رہا ہے؟ کچھ تو لوگوں کو اس کے بارے میں بھی بتایئے کہ آپ وہاں کیا کر رہے ہیں؟ اگر آپ ایسا نہیں کرتے، لوگوں کو بتانا نہیں چاہتے تو پھر کم از کم ہمیں تو وہاں جانے دیں۔بلوچستان میں ایسے علاقے بھی موجود ہیں جہاں آپ کا جنرل ضیاء بھی نہیں جا سکتا۔بلوچستان میں چالیس میلوں کی ایک ایسی ایریا بھی موجود ہے جہاں کے متعلق کسی کو بھی پتہ نہیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔جہاں اس ملک کے صدر کو بھی جانے کی اجازت نہیں ہے وہ علاقہ بلوچستان میں موجود ہے۔آپ لوگ تو یہاں صرف پنو عاقل فوجی چھاؤنی کے خلاف نعرے لگا رہے ہو لیکن ہم تو بڑے جگر کے لوگ ہیں کہ ہمارے گھر گھر میں فوجی چھاؤنیاں بنی ہوئی ہیں، ہر ایک گھر اور آشیانہ کے سامنے فوجی کھڑے ہیں۔

میرے بھائیو! انقلاب نعرے بازی سے نہیں آتا۔انقلاب نہ کوئی فسانہ ہے نہ ہی کوئی نعرہ اور نہ ہی کوئی بہترین فلم ہے۔انقلاب عوام لاتا ہے، جس کے لیے شرط یہ ہے کہ انقلاب کسی نظریہ اور کسی فلسفہ کے تحت لایا جائے۔آپ کے سوشل وڈیروں نے قومیت کے مسئلہ سے مُنہ موڑ رکھا ہے اور اس کے تحت ہی بنگال کے قومیت کے مسئلہ سے آنکھیں پھیر دی ہیں۔نتیجہ کے طور پر وہاں بور جوانیشنلسٹ جیت گئے وہاں جمہوریت شرما گئی، کیونکہ عوام کو جمہوری حق نہیں دیا گیا۔عوام نے انقلاب لایا، لیکن وہ انقلاب عوام کی خواہشات کے مطابق نتائج نہیں دے سکا۔انقلاب تو ہمیشہ عوام کی جانب سے ہی آتا ہے لیکن عوام کا ہمیشہ یہ المیہ رہا ہے کہ انقلاب ان کی خواہشات کے عین مطابق نہیں ہوتا۔پاکستان کی گیارہ لاکھ فوج بنگالیوں کو شکست نہ دے سکی لیکن آج چار ہزار بنگالی فوجی جملہ بنگالی عوام کے اوپر حکومت کر رہیں اور ساتھ ساتھ سامراج کے مفادات کا تحفظ بھی کر رہے ہے۔

میرے بھائیو! پاکستان میں پیداوار کا طریقہ کار جاگیردارانہ ہے اور فکر قبائلی ہے۔ہم بلوچوں کے رویہ سے ہی یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ہم قبائلی ہیں اور یہ ایک تاریخی حقیقت بھی ہے کہ ہم قبائلی ہیں اور بلوچستان میں قبائلی نظام ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ پختونوں اور سندھیوں میں بھی قبائلی سسٹم موجود ہے۔آپ نے یہاں جتنے بھی نام لیے ہیں، ان کے پیچھے کوئی نہ کوئی قبیلہ یا برادری کا نام شامل ہے۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں بھی قبائلی سسٹم مضبوط ہے۔

میں یہاں کچھ گہرائی میں جارہاہوں، آپ کو اس سے بوریت تو محسوس نہیں ہو رہی؟ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اب اس ملک میں جہاں پیداوار کا طریقہ کار جاگیردانہ اور فکر قبائلی ہے، وہاں بورجوا جمہوریت کی بات مجھ جیسے آدمی کو سمجھ میں نہیں آتی۔ کیونکہ جمہوریت تو خود ایک نقطۂ نظر ہے۔ آپ کس جمہوریت کی بات کرر ہے ہیں؟ کس کی جمہوریت کی بات کرر ہے ہیں؟ اور کس کے لیے جمہوریت چاہتے ہیں؟ کوئی بھی ہمیں یہ بات سمجھانے کے لیے تیار نہیں۔ جب آپ بورجوا جمہوریت کی بات کرتے ہیں، تب آپ کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایسی جمہوریت تو اس ملک اور قوم میں ہوتی ہے جہاں ایک بورجوا سماج ہوتا ہے، یہاں تو کوئی قومی بورجوا نہیں اور نہ ہی پیدا ہونا ہے، یہاں تو وہ لوگ بورجوا ہیں جو امریکہ اور دوسرے سامراجی ممالک کی دلالی کرتے ہیں۔ تو پھر یہ بورجوا جمہوریت کی چیخ و پکار کیوں ہو رہی ہے؟ انتخابات تو آپ کرواہی لیں گے لیکن ان انتخابات کے نتائج کو تسلیم کون کرائے گا؟ آپ کے پاس وہ کون سی طاقت ہے جو انتخابی نتائج کو تسلیم کروائے گی اور اسے نافذ کرے گی؟ یہ تو آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ نہ صرف پاکستان بلکہ پوری دنیا کی فوج غیر جمہوری ہے۔ فوج کبھی بھی جمہوریت کو پسند نہیں کرتی۔ ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ انتخابات کے بعد انتخابی نتائج کو تسلیم اور نافذ کون کروائے گا؟ اس کے علاوہ یہ بھی بتائیں کہ ایسی جمہوریت میں بلوچ، سندھی اور پختونوں کو کیا ملے گا؟ کیونکہ صرف ایک پنجاب کے پاس 115 نشستیں ہیں، بلوچوں، سندھیوں اور پختونوں کی جملہ نشستوں کو ملا کر بھی پنجاب سے 15 نشستیں کم پڑتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سندھیوں، بلوچوں اور پختونوں میں سے کون سے لوگ (عجیب وغریب قسم کے جانور) منتخب ہونے ہیں؟ کیونکہ یہ بھی پتہ نہیں کہ یہاں سے منتخب ہونے والے صحیح طور پر سندھی، بلوچ اور پختون بھی ہوں گے یا اور کوئی لوگ ہوں گے۔

اس حوالہ سے میں آپکو ایک مثال دوں گا کہ انگریزوں کے یہاں صدیوں سے ایک مثالی بورجوا جمہوریت چلی آرہی ہے۔ وہاں دو چار چھوٹی قومیتیں موجود ہیں، جیسا کہ ویلکو، ویلشکو وغیرہ لیکن صدیاں بیت گئیں، ان لوگوں کو اپنی زبان میں بات کرنے کے لیے صرف آدھا گھنٹہ ہی ملتا ہے تو پھر آپ سوچ لیں کہ آپکو کیا ملے گا؟ اور یہاں یہ جو جمہوریت کے نعرے لگ رہے ہیں وہ دراصل جاگیردارانہ سماج کو مضبوط کرنے کی کوشش ہی ہے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ مختلف نوع کے نعرے ایجاد ہوتے ہیں اور ان کے مؤجد یا تو جاگیردار ہیں یا جاگیرداروں کے دلال۔ کوئی خدا کا نام لے کر آتا ہے اور کوئی جمہوریت پسندی کی بات کرتا ہے۔ لیکن سبھی جاگیردارانہ نظام کی بقا کے لیے کوشاں ہیں۔ یہاں مختلف برگیڈ ہیں جو مختلف ناموں سے مظلوم قوم کے کسانوں، مزدوروں اور غریب عوام کے اوپر حملہ آور ہوتے چلے آرہے ہیں۔ چالیس برسوں سے لے کر آج تک ان کی یہ ہی جمہوریت رہی ہے۔ اب تو سامراج کے ہاتھ اس ملک میں اس قدر مضبوط ہو چکے ہیں کہ آپ کے ملک کا ہر فیصلہ

Scanned with CamScanner

وزیراعظم نہیں کرسکتا۔ آپ جونیجو صاحب کی شکایت کررہے ہیں لیکن ہمارے جونیجو کے ہاتھ میں کیا ہے؟ جنرل ضیاء کے ہاتھ میں بھی۔ یہاں جو بھی فیصلہ کرنا ہے وہ صدر ریگن کو کرنا ہے آپ کے بس میں کچھ نہیں۔ کچھ نہیں آپ کے یہاں امریکی فوجی اڈے ہیں، چنانچہ وہ جسے چاہیں گے اسے مسند اقتدار پر بٹھائیں گے اور جسے چاہیں گے اسے اقتدار سے معزول کردیں گے۔ ہر ایک وہی کرے گا جو امریکہ کی خواہش ہوگی۔ ہمارے یہاں بلوچی میں ایک کہاوت مشہور ہے کہ ایک بلوچ آدمی پہاڑوں سے نیچے اترا اور کسی شہر میں آکر دیکھا کہ کوئی آدمی مسجد کے مینار پر چڑھ کر اذان دے رہا ہے۔ اس بیچارے نے پہلے ایسا کوئی منظر نہیں دیکھا تھا چنانچہ اس نے مینار کے اردگرد گھوم کر دیکھا کہ اندر کوئی آدمی ہے جو چیخ و پکار کررہا ہے۔ اس بلوچ کو ایسی کوئی جگہ ہاتھ نہ آئی جہاں سے وہ اس آدمی کو مینار سے نیچے اتار سکے بالآخر اس نے کہا ''یار، چیختے رہو، میں کچھ نہیں کرسکتا، جس نے تجھے اوپر چڑھادیا ہے وہی تمہیں نیچے اتارے گا'' میرے بس کی بات نہیں۔ یہاں بھی ایسی ہی صورتحال ہے۔ حکمرانوں کو مسندِ اقتدار پر بٹھانے والا ہی اسے نیچے اتارتا ہے۔

آج افغانستان کے خلاف ڈالر جہاد ہورہا ہے، سامراج کی جنگ پاکستان کے اندر لڑی جارہی ہے۔ مُلا شاہی کی فلاسافی یہاں سے ایجاد ہوکر جاتی ہے جبکہ افغانستان کا انقلاب شعوری انقلاب ہے ارتقائی انقلاب نہیں۔ چنانچہ اسے ملاشاہی اور ڈالر جہاد پیچھے نہیں دھکیل سکتے۔ دنیا کی کوئی بھی طاقت افغان انقلاب کو واپس نہیں بھیج سکتی۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو پھر انسانی ارتقا کا فلسفہ ہی باطل ہوجائے گا، پوری انسانی تاریخ ٹھہر جائے گی۔ یہ بات امریکہ بھی جانتا ہے لیکن ہمارے حکمران چند ڈالروں کے عوض یہ شرمناک سودبازی کر بیٹھے ہیں اور ہمیں جنگ کا ایندھن بنادیا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے اسلامی جہاد کہا جارہا ہے۔ اگر تمہیں اسلام اور جہاد کا اتنا ہی شوق ہے تو پھر لبیا کیوں نہیں جاتے؟ تمہیں اسلامی جہاد صرف سندھیوں، بلوچوں اور پختونوں کے اوپر ہی آزمانا ہے۔ اور اللہ اکبر کے نعرے لگا کر ہماری بیٹیوں اور اولاد کو گولیوں کا نشانہ بنانا ہے، لبیا اور بیت المقدس میں بھی تو جاکر دیکھو، وہاں جانے کے لیے تمہیں بخار چڑھ جاتا ہے، لیکن ہمارے اوپر ہر وقت حملہ آور ہونے کے لیے تیار ہو؟ تو میرے بھائیو! یہ جو کچھ ہورہا ہے، آخر اس کا علاج کیا ہے؟ اور یہ کیا تماشہ ہورہا ہے؟ سوویت یونین بھی ایک بڑی طاقت ہے اور امریکہ سے کسی طور پر کم نہیں۔ وہ (سوویت یونین) کب تک تمہارا یہ تماشہ دیکھتا رہے گا کہ تم ڈالر جہاد والے یہاں مجاہدین کو بھیجتے رہو۔ یہ بیوقوف کہتے ہیں کہ ہم انسانی ہمدردی کی بنیاد پر ان بھگوڑوں اور غنڈوں کی مدد کررہے ہیں، لیکن اگر ردعمل میں سوشلسٹ بلاک بھی ایک لفظ کا اضافہ کرکے یہ کہے کہ ہم بھی خالص انسانی ہمدردی کی بناء پر پاکستان کے باشندوں کی مدد کرتے ہیں، تو پھر آپ کی کیا حالت ہوگی؟ پھر تو یقیناً وہ تھپڑ آئے گا جو ''اُما کمیٹی'' اور ''اَما کمیٹی'' کو برابر کردے گا۔ لیکن چونکہ ہمارے حکمرانوں کو کوئی سبق نہیں

سیکھنا، چنانچہ وہ وہی کچھ کرتے ہیں جس کا امریکہ کی جانب سے انہیں حکم ملتا ہے۔

مجھے بہت خوشی ہے اور ایک غیر واضح روشنی کی کرن بھی نظر آ رہی ہے کہ پُرانی قیادت، پُرانا فکر اور پُرانے سیاسی چور دروازے پیچھے کی جانب ہو رہے ہیں اور نو جوان نسل بڑی تیزی کے ساتھ آگے آ رہی ہے اور یہی ہماری زندگی کی سچی تمنا ہے کہ نو جوانوں کو آگے بڑھتا دیکھیں کیونکہ ہم تو ماضی بن چکے اور ماضی کے مزارات کا کیا حال ہوگا! اب تو آئندہ کی فکر کرنی چاہئے۔ سامراج نے مختلف رنگین پھندے پھینکے ہیں۔ شکاری وہی پرانے ہیں۔ سامراج کی جال میں سے کسی کا رنگ سبز ہے تو کسی کا سرخ، ہر ایک کا اپنا اپنا رنگ ہے کیونکہ یہ ایک انسانی فطرت ہے۔ لیکن یہ تو ہمیں جانور سمجھتے ہیں اور جس طرح ہر جانور کوئی نہ کوئی رنگ پسند کرتا ہے، یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جو رنگ جس جانور کو پسند ہو اسی رنگ کا جال اس کے اوپر پھینکا جائے اور وہ اس میں پھنس جائے۔

یہ جو آپ لوگ مختلف چھوٹی بڑی باتیں کرتے ہیں یا جو اکیڈمک باتیں کرتے ہیں، وہ دراصل جہاں تک میرا تجربہ ہے یا جہاں تک میں جانتا ہوں یا میں نے عمل کیا ہے۔ میں جیلوں کی بات نہیں کرتا کیونکہ میں اسے عمل نہیں سمجھتا، میں نو برس تک کمانڈر رہا ہوں، چنانچہ میں نے اگر انقلاب کا دوبارہ مشاہدہ کیا تو بھی اسے قریب سے ضرور دیکھا ہے وہ اس قدر خوبصورت اور حسین ہے کہ اس جیسی حسین کوئی اور خوبصورت چیز دنیا میں ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر آپ ایک بار انقلاب کی خوبصورتی کا مشاہدہ کر لیں تو پھر دنیا کی ساری خوبصورت چیزیں آپ بھول جائیں گے۔ اس کی خوبصورتی دیکھنے کے بعد آپ جنون کی حد تک پاگل ہو جائیں گے۔

تو میرے بھائیو! میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب تک آپ اپنے قومی حقوق حاصل نہیں کر لیتے تب تک سامراج کے اوپر لعنت بھیجتے رہو جو یہاں خیر پور میں بیٹھ کر صدر ریگن تک پہنچ پائے۔ آخر ریگن تک یہ لعنت ملامت کس طرح پہنچے گی؟ یہ تو یہیں دیواروں سے ٹکرا کر واپس آ جائے گی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انقلاب صرف نعرہ بازی سے نہیں آتا میں آپ نو جوانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ آپ خود کو اس بور جو سیاست سے باہر نکالیں اور عمل کی جانب بڑھنے کی کوشش کریں۔ جب تک آپ عمل کی سیاست نہیں کریں گے، تب تک صرف نعرہ بازی ہی کرتے رہیں گے اور اس طرح بیچارہ مزدور اور کسان بھی صرف نعرے لگانے میں مصروف ہوگا اور عمل وہ بھی نہیں کرے گا۔ پھر آپ انقلاب کیسے لے آئیں گے؟ اگر آپ صرف نعرہ بازی کرتے رہیں، گے تو پھر پورا ملک ایک نعرہ بن جائے گا لیکن اب تو یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ اس ملک میں کونسا نعرہ لگانا چاہئے، پورا ملک صرف نعرہ بن چکا ہے۔

میں آپ کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ سندھ میں جو کچھ ہو رہا ہے یا ہوگا، بلوچ اس سے ضرور متاثر ہوگا۔ چاہے یہ ہماری خواہش ہو یا نہ ہو بلوچ کبھی بھی آپ سے منہ موڑ نہیں سکتا۔ ہمارا جو بھی

Scanned with CamScanner

حال ہوگا وہ آپ کے لیے حاضر ہوگا۔ ہم یہ صرف آپکو نہیں بلکہ آپ کے دوسرے دشمنوں کو بھی بتانا چاہتے ہیں کہ جب بھی وہ سندھیوں کے اوپر حملہ آور ہونے کے لیے اپنے پر تولیں تو ایک نظر بلوچوں کی طرف بھی ضرور دیکھیں، کیونکہ بلوچ، سندھی کی مدد کیلئے ضرور آئے گا اور یہ لازمی اور اشد ضروری ہے۔

سندھیوں اور بلوچوں کے درمیان ایک تاریخی رشتہ ہے، اور یہ رشتہ میرا اور تمہارا قائم کردہ نہیں بلکہ یہ رشتہ دو قومیتوں کے بیچ تاریخ کا قائم کردہ ایک مضبوط رشتہ ہے، یہ سسی اور پنہوں کا رشتہ ہے، یہ الگ بات ہے کہ ہم نے آپ سے کچھ قدر بیوفائی کی ہے (ہنستے ہوئے) لیکن ہم یہ قرض ضرور اتاریں گے۔ جب ہمارے پاس کچھ ہوگا تو ہم آپ لوگوں کا قرضہ ضرور اتاریں گے۔ فی الحال تو دونوں کے پاس کچھ بھی نہیں، سندھی اور بلوچ دونوں کے ہاتھ خالی ہیں۔

میرے بھائیو! جب تک اس ملک سے جاگیرداری کا خاتمہ نہ کیا جائے تب تک اس ملک میں کچھ بھی اچھا نہ ہوگا۔ آج آپ کے ملک کا جاگیردارانہ نظام اس قدر بوسیدہ ہو چکا ہے کہ وہ اپنی طبعی عمر کو پہنچ چکا ہے۔ میں خود بھی ایک جاگیردار ہوں اور آپکو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آپ اس طبقہ کو نہیں پہچانتے، مجھے پتہ ہے کہ یہ طبقہ کس قدر کمینہ اور پلیت ہے اور کتنا ذلیل اور قوم فروش ہے۔ یہ مجھ سے پوچھیئے کیونکہ میں اسے اچھی طرح جانتا اور پہچانتا ہوں۔ یہ طبقہ اب بوڑھا ہو چکا ہے اور اپنی عمر پوری کر چکا ہے۔ فارسی میں ایک شعر ہے جس کا ترجمہ ہے "بد فعل عورت جب بوڑھی ہو جاتی ہے، تب وہ دلالی کرتی ہے۔" ہمارے آج کے جاگیردار کا بھی یہ ہی کام بچا ہے۔ وہ اب صرف دلالی ہی کرتا ہے۔ جو بھی حکمران آئے گا یہ اس کی دلالی کرلے گا اور آپکو فروخت کرلے گا۔ آپ ہی بتائیں کہ اب یہ طبقہ یہی کچھ کر رہا ہے یا اور کچھ؟ میں صرف سندھ کی نہیں بلکہ پورے پاکستان کی بات کر رہا ہوں اور جس طبقہ کا میں خود ایک فرد ہوں یہ طبقہ اب بوڑھا ہو چکا ہے۔ چنانچہ یہ صرف دلالی ہی کرے گا آپکو فروخت کرے گا اور پھر اقتدار کے مزے لوٹے گا، اس طبقہ کا دفاع اب صرف فوجی لانگ بوٹ ہی کر رہا ہے، کیونکہ اگر فوجی لانگ بوٹ نہ ہو تو یہ طبقہ ایک دن بھی زندہ نہ رہ سکے گا، اسکو اب صرف سندھی، بلوچ اور پختون عوام ہی کسی گہری کھائی میں اچھال سکتا ہے، جہاں کسی کو یہ معلوم نہ ہوگا کہ یہ کہاں مرا اور کب مرا۔

آپ یہاں بیٹھ کر نعرے لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مزدور کا ہتھوڑا سرمایہ دار کے کاندھوں پر ہوگا، لیکن میں کہتا ہوں کہ بھائی پہلے یہ ہتھوڑا اپنے کاندھوں پہ رکھو، آپ کے اپنے کاندھوں پر ہی ہتھوڑا نہیں ہے تو پھر سرمایہ دار کے کاندھے پر کس طرح ضرب لگاؤ گے؟ اس وقت ہمارا اپنا کاندھا ہتھوڑے سے خالی ہے۔ کارخانوں میں تمہارا اپنا سندھی مزدور نہیں۔ پہلے اسے مزدور بناؤ، پرولتاریہ ہونے دو، جدید سماجی تاریخ کا خالق بناؤ انہیں جدید پیداواری قوت کا حق لے کر دو، پھر سرمایہ دار سے جنگ کرو تب ہی اصل جنگ ہوگی۔ اس وقت آپ کے نعرے صرف خیالی

Scanned with CamScanner

ہیں۔ میرے بھائیو! میری گذارش ہے کہ ہمیں کسی سے کوئی نفرت نہیں جس کا جو بھی فکر ہو وہ اپنے فکر کو آگے بڑھائے اور اس کی تبلیغ کرتا رہے۔ ہمیں کسی سے کوئی خوف نہیں اور نہ ہی ہم کسی سے ڈرتے ہیں جو کوئی بھی انسانیت کی خدمت کے واسطے تیار ہے، ہم اسے سلام کہتے ہیں اور اس کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن ایک بات کو واضح کرتا چلوں کہ ہم اپنی نسل، اپنی قوم اور اپنے آخری بچہ کو بھی قربان کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن اپنے قومی حقوق، اپنے وجود اور اپنے قومی تشخص، ثقافت اور وطن سے دستبردار قطعاً نہیں ہوں گے۔

ایک اور بات کی بھی وضاحت کرتا چلوں کہ ہم اور آپ اب ان لوگوں کے غلام بن کر نہیں رہیں گے۔ یا تو ہمیں اپنے قومی حقوق دو یا پھر تاریخ کے راستہ کا انتظار کرو۔ اب ہمیں ان کا غلام نہیں بننا اور یہ ہمارا آخری فیصلہ ہے۔ ہم نے اپنا فیصلہ کر لیا ہے، اب تمہیں فیصلہ کرنا ہے۔ ہماری نسل مٹ سکتی ہے لیکن ہم آپ کے غلام نہیں ہو سکتے۔ اپنے قومی حقوق سے دستبردار نہیں ہو سکتے۔ پانچ کیوں پچاس ڈویژن فوج لا کر کھڑے کر دو اب پہلے والی جنگ نہیں ہوگی، کیونکہ ڈالر جہاد کے بعد اب اسلحہ کی بھرمار ہے، اتنی تعداد میں بازار سے بال بھی نہیں ملتے جہاں دیکھو وہاں اسلحہ کی بھرمار ہے۔ صرف ہم سندھی، بلوچ اور پختونوں کو آپس میں اتحاد کرنا ہے، متحد ہوتا ہے کیونکہ دشمنی متحد اور منظّم اور مسلح ہے۔ اس لئے سب سے پہلے سندھی اور بلوچ متحد ہو، لیکن یہ اتحاد وڈیرہ کی سطح پر نہ ہو، کسی سردار کی سطح پر نہ ہو اور نہ ہی کسی خان کی سطح پر ہو، کیونکہ ایسے اتحاد دونوں کے اندر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہمیں اپنا اتحاد عوام کی سطح پر کرنا ہوگا ایک دوسرے کے عوام کا احترام کرنا ہوگا۔ تاہم اس میں بھی ایک دشواری ہے، چونکہ یہاں چار قومتیوں کا سماجی ارتقا برابری کی بنیاد پر نہیں ہے اور نہ ہی ہمارے پاس جنگ کے لیے کوئی مشترکہ محاذ ہے، چنانچہ میں نہیں سمجھتا کہ یہاں کوئی مشترکہ جدوجہد بھی ہوگی۔ کم از کم تاریخ میں ایسا نہیں ہوا، پختون قوم کو جنگل میں ایک منگل کرنا پڑے گا، آپ لوگوں (سندھیوں) کو ہوشو شہید کا نعرہ لگانا پڑے گا اور مجھے بالاچ خان کی پیروی کرنی پڑے گی۔ جب یہ ہمیں اپنے حقوق نہیں دیں گے اور جب ہم ایک مخصوص عمل سے گزریں گے، تب ہم مشترکہ جدوجہد کریں گے۔ اتحاد کسی مقصد کے لیے ہوتا ہے، اتحاد کچھ بنیادوں پر ہوتا ہے، صرف نعرہ بازی پر اتحاد نہیں ہوتا۔ تو پھر آیئے آج یہ عہد کریں کہ ہمیں کسی سے کوئی شخصی نفرت نہیں، ہمیں ہر ایک سے پیار ہے، جملہ انسانیت سے پیار ہے، ہمارے صرف دو دشمن ہیں، ایک سامراج، جو بین الاقوامی دہشتگرد ہے، جو آج لیبیا کے اوپر حملہ آور ہوتا ہے اور بڑی بے شرمی سے کہتا ہے۔ میں دہشتگردی کو روکنے کے لیے ایسا کر رہا ہوں، حالانکہ کہ وہ خود بڑا دہشتگرد ہے جو دوسرے ممالک کے اوپر حملہ آور ہوتا ہے، اور دوسرا وہ طبقہ ہمارا دشمن ہے جو نہ صرف ہمارے عوام کا استحصال کرتا ہے بلکہ ہماری قوم کو فروخت بھی کرتا ہے۔ یہ دونوں ہمارے دشمن ہیں اور دنیا کی جملہ مظلوم قومیں اور تمام مظلوم طبقہ ہمارے اتحادی

اور ساتھی ہیں۔ چنانچہ میں یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ یہ تاریخ کا فیصلہ ہے کہ عوام انقلاب چاہتا ہے اور قومیں آزادی چاہتی ہیں، چنانچہ دونوں کو ساتھ چلنا پڑے گا۔ اگر آپ صرف قومیت کی بات کریں گے تو پھر آپ فاشسٹ ہیں، اور اگر آپ صرف مزدور کی بات کریں گے تو پھر آپ ٹریڈ یونینسٹ ہیں لیکن مارکسٹ یا انقلابی نہیں۔

آپ کے یہاں سندھ میں جو ایم آر ڈی کی تحریک چلی تھی، میں نہیں سمجھتا کہ وہ جمہوری تحریک تھی، وہ ایک خودرو قوم پرست تحریک تھی۔ یہ میرا اپنا تجزیہ ہے۔ میں نے اس وقت آپ کی جملہ سندھی جماعتوں اور ان کی قیادت کو کہا تھا کہ اس تحریک میں چلنے والی بندوق کو فکر کے کنٹرول میں لایا جائے کیونکہ میں ایک گوریلا کمانڈر رہا ہوں اور میں نے گوریلا جنگ لڑی ہے، چنانچہ میرا کہنا یہ تھا کہ اگر تم اس بندوق کو فکر کے کنٹرول میں نہیں لے آئے تو پھر یہ بندوق خود سندھیوں کے لیے بدترین دشمن بن جائے گی۔ پھر آپ نے دیکھ لیا کہ آپ کی جماعتوں میں سے کوئی بھی جماعت آگے نہ بڑھ سکی اور نہ ہی بندوق کو فکر کے کنٹرول میں لیا گیا۔ جس کے نتیجہ میں سندھی کی بندوق خود سندھی کے خلاف استعمال ہونے لگی ہے اور اب بات یہاں تک جا پہنچی ہے کہ سندھ کے ڈاکو سندھی لوگوں کو چٹھیاں بھیج رہے ہیں کہ فلاں فلاں چیزیں پہنچاؤ کیونکہ بندوق فکر کے کنٹرول میں نہیں بلکہ بندوق کی کمان میں آچکی ہے جس کا نتیجہ یہی ہونا تھا۔ بندوق ایک مضبوط عنصر تو ضرور ہے تاہم فیصلہ کن عنصر نہیں، فیصلہ کن اور بنیادی عنصر آپ کا فکر، نظریہ اور اخلاق ہے اور آپ کا عمل ہے۔

اب جناب ہمارے صدر اور وزیراعظم ضیاء الحق اور جونیجو اسلام آباد میں بیٹھ کر اسلام لا رہے ہیں۔ پچھلے دن سانگھڑ میں ایک صحافی نے مجھ سے پوچھا کہ اسلامی نظریہ کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ میں نے اسے کہا "بھائی! کونسا اسلام؟ یہاں تو چالیس پچاس اسلام ہیں۔ جس اسلام کے متعلق پوچھو، میں اس کی تشریح کروں۔ جو کچھ بنگالیوں سے آپ نے کیا وہ اسلام، جو کچھ بلوچوں سے کیا وہ اسلام، سندھیوں کی جو زمینیں قبضہ میں لیں وہ اسلام، سندھیوں کا جو قتل عام کیا وہ اسلام، پختونوں کے ساتھ آپ نے جو کچھ کیا وہ اسلام، آخر آپ کس اسلام کی بات پوچھنا چاہتے ہیں؟ جس اسلام کے متعلق پوچھیں میں بتاؤں۔ یہاں تو کئی قسم کے اسلام موجود ہیں میں۔ نے اسے کہا کہ تم جس قوم سے وابستہ ہو، اس خطہ میں ایک انقلابی شاعر ہو گذرا ہے جسے میں ایک بہت بڑا انقلابی شاعر مانتا ہوں اس نے کہا ہے کہ۔

"وے ملا چھوڑ دے علم کتاباں دا کیوں چکیا ای بار عذاباں دا
وضو کرتے شوق شراباں دا تیرے اندر باہر پلیتی اے۔
میں نے اسے کہا کہ "تو وہی ملا ہے اور تیرے ظاہر اور باطن دونوں میں پلیتی ہے"

اس بات پر وہ خود بھی ہنسنے لگا تھا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ تو وہ ملا ہیں جو صرف اذان دینا جانتے ہیں، اور انہیں کے لیے بلھے شاہ نے فرمایا تھا:

''مُلے کنوں ککڑ چنگا، جو سُتے یار جگاوے''

لیکن یہ لوگ تو نیند سے بیدار نہیں کر سکتے، ان لوگوں سے وہ مرغا بہتر ہے جو نیند سے جگاتا ہے......!!۔

میرے خیال میں میں نے آپ کا کچھ زیادہ ہی وقت لے لیا ہے، اس کے لیے میں آپ سب کا شکر گذار ہوں۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ ہوشو شہید اور شاہ لطیف کی سرزمین پر جا کر دیکھوں کہ وہاں کس قدر گرمی ہے اور کتنا پسینہ بہا ہے۔ اختتام پر میں آپکو صرف ایک گذارش کروں گا اور وہ بھی شاہ لطیف کی زبان میں کہ

''واکا کرن وس موں۔ بدھن کم بروچ جو''

یعنی:۔''آواز دینا میرے بس میں ہے (میں تو وہ کام کر رہا ہوں لیکن سننا اور عمل کرنا آپ لوگوں کا کام ہے۔) وہ آپ کو کرنا ہے آپ کرینگے تو نتیجہ ضرور ملے گا......!!؟

کچھ دیر شیر محمد مری کے ساتھ

یہ ایک سادہ مگر پُروقار تقریب تھی۔ مہمان خصوصی تھے جناب شیر محمد مری جو سات برس تک بلوچستان کے دشوار گذار پہاڑوں میں بسیرا بنائے ہوئے تھے۔ دو ہزار پانچ سو پچپن روز تک وہ ہر لمحہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ظلم و جبر کے خلاف لڑتے رہے اور آخر کار ایک روز ایوب خان کی آمریت کا محل گر پڑا اور پہاڑوں کے فرزند، امن اور آشتی کا پیام لئے نیچے اُتر آئے۔ ان میں شیر محمد مری بھی تھے جنہیں انکے قبیلے کے افراد اور دوسرے احباب پیار اور محبت سے "شیرو مری" بھی کہتے ہیں۔

کوئٹہ میں بلوچستان اسٹوڈینٹس آرگنائزیشن نے انہیں ایک استقبالیہ دیا۔ نیپ ولی گروپ کے ہیڈ کوارٹرز کے وسیع ہال میں بلوچ اور پشتون طلباء، ادیبوں، دانشوروں، سیاسی کارکنوں اور صحافیوں کے علاوہ مری قبیلے کے سردار خیر بخش خان مری بھی موجود تھے۔

اس تقریب میں شیر محمد مری نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے فخر ہے کہ میں اپنے پیارے وطن بلوچستان کی ترجمانی کے فرائض سرانجام دے رہا ہوں۔ بلوچستان جو آمریت کے بدترین دور میں دس سال تک مسلسل جلتا رہا۔ اس آگ کے شعلے ہر ذی شعور شخص کو اپنی لپیٹ میں لیتے رہے، مگر مجھے فخر ہے کہ بلوچستان نے جبر و استبداد کی قوتوں کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ مگر ہماری سات سالہ جدوجہد کسی خاص فرد یا مخصوص طبقے کیلئے نہ تھی۔ بلکہ یہ ایک عوامی جدوجہد تھی۔ جو عوامی مفاد اور تقاضوں کے عین مطابق تھی۔"

ون یونٹ کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا "ون یونٹ عوام کی مسلسل کوششوں اور قربانیوں کے باعث ہی ختم ہوا۔ لیکن میں اسکی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک یونٹ کے خاتمہ سے آپ کے دکھ، درد اور پریشانیاں دور نہ ہوں گی۔ عوامی مسائل کو حل کرنے کے

Scanned with CamScanner

[illegible] ستہ قائم کر[illegible]نے کی کوشش کیجئے اور استحصالی طبقے کو ختم کرنے کی خاطر مزدوروں، کسانوں اور دانشوروں کا وسیع محاذ بنانے کی طرف پہلا قدم اٹھائیے۔''

انہوں نے کہا کہ بعض عناصر اپنے ذاتی اغراض کیلئے بلوچ اور پشتون کا مسئلہ کھڑا کر رہے ہیں۔ بلوچوں اور پٹھانوں کے تعلقات اتنے ہی پرانے ہیں، جتنی کہ ہماری یہ دھرتی پرانی ہے۔ ہمیں کندھے سے کندھا ملا کر اس دیس کی تعمیر کرنا اور غربت اور افلاس کو دور کرنا ہے۔

اس سے قبل بی ایس او کے صدر خیر محمد بلوچ نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''بلوچوں نے ماضی میں اپنی آزادی کی بقا کے لئے انگریزوں سے پیہم لڑائیاں لڑیں اور اپنے جذبۂ حریت کو ہمیشہ زندہ رکھا۔ ایوبی دور میں یہاں کے بلوچوں پر افتاد آن پڑی تو انہوں نے اس کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور یہ حقیقت ہے کہ بہادر بلوچ شیرو کی قیادت میں ایک آمر مطلق کی طاقت سے نبرد آزما رہے۔''

(ہفتہ روزہ ''لیل و نہار'' کراچی 12 جولائی 1970ء)

Scanned with CamScanner

جنرل شیروف کے

چند تاریخی انٹرویوز

Scanned with CamScanner

شیرو مری

پاکستان میں سوشلسٹ انقلاب بلوچستان سے آئے گا

بلوچستان کے ممتاز رہنما جناب شیر محمد مری ان دونوں اسیری کی زندگی گذار رہے ہیں، ان پر 20 ہزار چھاپا ماروں کو تربیت دینے اور علیحدگی کا الزام عائد کیا گیا ہے۔ اکتوبر 1972ء میں لندن میں قیام کے دوران ہفت روزہ جدو جہد لندن کے رپورٹر جناب احمد شجاع نے ان سے انٹرویو لیا۔ بعد میں یہ انٹرویو پاکستان فورم کینیڈا نے شائع کیا ہم اس انٹرویو کو پاکستان فورم کے شکریئے کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔

سوال: بنگال کی علیحدگی سے ہمیں کیا سبق ملنا چاہیئے؟

جواب: ایک بڑے طویل عرصے سے پاکستان کے مختلف حصوں میں نفرت پھیل رہی ہے۔ تعصب، جنون، نفرت کے سائے تیزی سے پھیل رہے ہیں۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ مشرقی پاکستان اور دیگر چھوٹے صوبے یہ بات شدت سے محسوس کرتے ہیں کہ پنجاب کا سرمایہ دار، نوکر شاہی اور حکمران ٹولہ ان سے انصاف نہیں کرتا۔ ان کے حقوق کو سلب کر رہا ہے۔ یہ نفرت اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتی جب تک منصفانہ طور پر ملک کی دولت کی تقسیم نہیں کی جاتی۔ البتہ قومیتوں کی بنیاد پر مختلف صوبوں کو مساوی نمائندگی دیکر وقتی اور عارضی طور پر لالچی اور خود غرض صوبہ پرستوں کا منہ بند کیا جا سکتا ہے لیکن یہ کوئی مستقل حل نہیں ہے۔ عوامی جدو جہد کا نشانہ صرف پنجابی سرمایہ دار ہی نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ ہمارا اولین مقدس مقصد عوام کے تمام دشمنوں کا خاتمہ کرنا ہے خواہ وہ پنجابی ہو، سندھی ہو، پٹھان یا بلوچ ہو۔ پاکستان ایک کثیر الاقوامیت ملک ہے۔ کثیر القومیتی ریاست کے مسائل کا واحد حل کمیونزم ہے۔ پاکستان سے بنگلہ دیش کی علیحدگی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ کسی ملک کی بنیاد مذہب پر نہیں ہوتی۔ اگر اس بنیاد پر کوئی ملک قائم کیا گیا تو وہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ ہم پاکستان کی بنیاد صحیح خطوط پر استوار کر سکتے ہیں۔ بورژوا جمہوریت عوام کو صرف دھوکہ اور فریب دے سکتی ہے لیکن زیادہ عرصہ تک نہیں۔ موجودہ نام نہاد جمہوری نظام، عوام کے خلاف ایک سازش ہے۔ جس کا مقصد سرمایہ داروں کے حقوق اور

Scanned with CamScanner

استحصال کے حق کا تحفظ کرنا اور برقرار رکھنا ہے۔ اس استحصالی نظام کو ایک منظم اور مسلح انقلاب کے ذریعے ہی ختم کیا جاسکتا ہے۔ ایسا مسلح انقلاب جس کا مقصد سوشلسٹ پاکستان کا قیام ہو۔

سوال: پاکستان کی مختلف جماعتیں سوشلسٹ ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں۔ ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: پاکستان میں کوئی حقیقی مارکسی پارٹی نہیں ہے۔ نام نہاد ''بائیں بازو'' کی جماعت نیشنل عوامی پارٹی، پاکستان کے رجعت پسند مولویوں کے اشتراک سے ایک ''کامن فرنٹ'' بنانے کی کوشش کررہی ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کا بھی دعویٰ ہے کہ وہ ایک سوشلسٹ پارٹی ہے لیکن اس کے پرچم تلے ملک کے بدنام اور بدعنوان افراد جمع ہوگئے ہیں، اپنی طاقت کے بل بوتے پر عوام کا استحصال جاری رکھنا چاہتے ہیں۔

سوال: کیا بلوچ پاکستان سے علیحدہ ہونا چاہتے ہیں؟

جواب: نہیں ہرگز نہیں، غلط بالکل غلط، درحقیقت ملک کے خودغرض اور مفاد پرست عناصر دوسرے صوبوں کے عوام اور خصوصاً میرے پنجابی بھائیوں کو گمراہ کرنے کیلئے بلوچ عوام پر الزام لگارہے ہیں۔ ہمارے ان رہنماؤں نے جو ہم پر علیحدگی کا الزام لگارہے ہیں۔ بنگالی عوام کے حق خودمختاری کے مطالبہ کو اس لئے تقسیم نہیں کیا کہ اگر یہ مطالبہ تسلیم کرلیا گیا تو وہ مشرقی صوبے کا استحصال نہیں کرسکیں گے۔ بلوچ، سندھیوں، پٹھانوں کے مطالبات کو بھی اسی وجہ سے تسلیم نہیں کیا جارہا ہے۔ صوبائی تعصب اور نفرت ان خودغرض اور مفاد پرست عناصر کے لئے فائدہ مند ہوتی ہے کیونکہ ان خطوط پر زور دینے سے عوام وقتی و عارضی طور پر صحت مند طبقاتی سیاست اور معاشیات کو بھول جاتے ہیں۔ طبقاتی جنگ اسی وقت شروع ہوسکتی اور زور پکڑسکتی ہے، جب قومی تنگ نظری اور استحصال کا خاتمہ ہوجائے۔ ہمارا حکمران طبقہ طبقاتی جنگ کا رخ موڑنے کیلئے مذموم حرکات اور گمراہ کن پروپیگنڈہ کررہا ہے۔

سوال: پاکستانی بورژوا رجعت پرست پریس ہمیشہ شاہ ایران کو پاکستان کا بہترین دوست کہتے ہیں۔ بلوچ عوام کو ایرانی حکمرانوں سے براہ راست تجربہ ہوا۔ ان تجربات کی بنیاد پر کیا آپ اس دوستی کے دعویٰ پر روشنی ڈال سکتے ہیں؟

جواب: (ایک پنجابی کہاوت کے بعد) ملک کے دوسرے علاقوں کے عوام کو اس سلسلہ میں پروپیگنڈہ کے ذریعے گمراہ کیا جاسکتا ہے، لیکن بلوچوں کو نہیں۔ کیونکہ وہ ایران کی سرحد کے نزدیک رہتے ہیں۔ صدیوں تک ایرانی حکمرانوں کے ظلم وتشدد جبر کا نشانہ بنے ہیں۔ ہم اس

''دوست'' سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ قیام ملک کے فوراً بعد پاکستان پر پہلا حملہ کس نے کیا؟ کس نے 12 ہزار میل پاکستانی علاقے پر قبضہ کیا؟ تافتان کا علاقہ کس کے تسلط میں ہے؟ ان سوالات کا صرف ایک ہی جواب ہے، ہمارا دوست ''ایران''۔

جنگ کشمیر کے دوران جب پاکستان کی پوری توجہ تنازعہ پر مرکوز تھی ایران نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور قلعہ صفیہ پر قبضہ کرلیا۔ یہ قلعہ آج بھی اس کے تسلط میں ہے۔ ایران کے نقشہ میں اب بھی بلوچستان کو ایرن کا حصہ دکھایا جاتا ہے۔ آریا مہر کی تقریبات کے موقع پر ایران کا جو سرکاری نقشہ جاری کیا گیا، اس میں پاکستانی علاقہ یہاں تک کہ ملتان کو بھی ایران کا حصہ دکھایا گیا۔ کوئٹہ میں ایران ہاؤس کی افتتاحی تقریب کے موقع پر پاکستان میں مقیم ایرانی سفیر نے کہا۔ ''بلوچستان کی سرزمین سے مجھے ایران کی خوشبو آتی ہے''۔ اس تقریب کے بعد بلوچ طلبہ نے ایران ہاؤس کو نذر آتش کردیا اور گلیوں میں شاہ ایران کی تصویروں کو جلایا گیا۔ پاکستان کو دوستوں کی ضرورت ہے، مگر کیا دوستوں کو ایرانی حکمرانوں جیسا رویہ اختیار کرنا چاہئے؟

سوال: ایرانی بلوچ، ایرانی حکومت کے خلاف جدوجہد کررہے ہیں، آپ ان کے لئے کیا کررہے ہیں؟

جواب: ایران کے دیگر شہروں کی طرح بلوچ بھی سرکاری تشدد اور جبر واستبداد کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ ایرانی فوج کے ظلم وجبر سے بچنے کے لئے سینکڑوں بلوچوں نے پاکستان میں پناہ لے رکھی ہے۔ ہم نے ان کی ہر طرح سے مدد کی اور اب بھی کررہے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ پاکستان کے سرمایہ دار حکمرانوں نے بلوچ عوام کے خلاف شاہ ایران سے گٹھ جوڑ کرلیا ہے۔ امریکہ، ایران کے حریت پسندوں کو کچلنے کے لئے لامحدود اسلحہ سپلائی کررہا ہے۔

سوال: پاکستان میں سوشلسٹ انقلاب کے کیا امکانات ہیں؟

جواب: مجھے یقینِ کامل ہے کہ پاکستان میں سوشلسٹ انقلاب بلوچستان سے آئے گا۔ بلوچستان کا ایک وسیع حصہ استحصالی قوتوں سے آزاد ہے اور ان آزاد علاقوں میں ہم اپنی روایات کے مطابق سوشلسٹ نظام پر عمل کررہے ہیں اور وہ وقت دور نہیں جب ہمارے پنجابی، سندھی، پٹھان بھائی ہماری جدوجہد میں شامل ہوجائیں گے اور ہم سب مل کر پاکستان کو صحیح معنوں میں آزاد ملک بنائیں گے۔

پاکستان میں مختلف قومیتیں آباد ہیں اور ملک اسی وقت اور اسی صورت میں خوشحال ہوسکتا ہے جب ان قومیتوں کے درمیان اتحاد ہو۔ یہ اتحاد اسی صورت میں قائم ہوسکتا ہے جب تمام پاکستانی

عوام یہ محسوس کریں کہ وہ سب برابر ہیں اور کسی کو دوسروں کے انسانی حقوق پر ڈاکہ نہیں ڈالنا چاہئے۔ ایک کمیونسٹ معاشرہ اس استحصال کا خاتمہ کردے گا جو عوام کے درمیان نفرت کی دیوار کھڑی کرتا ہے۔ ہمارے حکمران عوام میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ وہ اپنی بداعمالیوں اور استحصال کو جاری رکھ سکیں۔ پنجابیوں، سندھیوں، بلوچیوں اور پٹھانوں کے درمیان پائی جانے والی نفرت کے ذمہ دار ہمارے خودغرض رہنما اور وہ مردہ نظام ہے جو پاکستان میں نافذ ہے۔

سوال: بنگال میں یحییٰ خان کی فوجی کارروائی کے دوران عوام نے ہمارے حکمرانوں کے جھوٹے پروپیگنڈہ پر یقین کرلیا تھا۔ اس فوجی اقدام کے بارے میں بلوچوں کا کیا ردِ عمل تھا؟

جواب: بنگالیوں کے خلاف جو فوجی کارروائی کی گئی وہ ہمارے لئے کوئی حیرت انگیز بات نہیں تھی۔ ہزاروں غیر مسلح بنگالیوں پر جو کچھ گذری، وہ ہم پر 1947ء سے گذر رہی ہے۔ ہمارے پاس ظلم وتشدد کے کئی ثبوت ہیں۔ ہم پر نیپام بم برسائے گئے۔ اگر کسی کو اس بات پر شک ہے تو ہم اسے ان بموں کے ٹکڑے دکھا سکتے ہیں۔ بلوچستان میں پانی کے کنوؤں کو زہر آلود کردیا گیا۔ عورتوں اور بچوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا اور زخمیوں کو قتل کردیا گیا۔ ایوب خان کے زمانے میں یہ ظلم اپنی انتہا پر پہنچ گیا۔ ہم نے کئی فوجیوں کو گرفتار کرلینے کے باوجود اس توقع پر رہا کردیا کہ وہ اپنے علاقے کی عوام کو ہمارے حالات اور موقف سے آگاہ کریں گے۔

پاکستان کے دوسرے علاقوں کے عوام ہم پر گذرنے والی قیامت سے بے خبر رہے۔ کیونکہ ہمارا پریس پابند ہے اور اس پر سرمایہ داروں کا قبضہ ہے۔ اس کے علاوہ بے ایمان اور خودغرض رہنماؤں نے گمراہ کن پروپیگنڈہ کیا۔ سوشلسٹ دوستوں سے ہمارا رابطہ نہ تھا۔ اگر یہ اسباب نہ ہوتے تو مجھے یقین ہے کہ ملک کے دیگر علاقوں سے ہمارے بھائی ہماری مدد کو ضرور آتے۔

ہماری تحریک شیخ مجیب الرحمان کی تحریک کی طرح کوئی بورژوا تحریک نہیں ہے۔ ہماری تحریک اور جدوجہد کمیونسٹ کردار کی حامل ہے اور بندوق ہمارا مذہب ہے۔ بندوق، جس کو اٹھانے کا مقصد دیگر علاقوں کے عوام کو غلام بنانا نہیں بلکہ ملک کے تمام عوام کو ظالمانہ نظام سے نجات دلانا ہے۔

پاکستانی عوام پر مجھے یقینِ کامل ہے وہ وقت دور نہیں جب جھوٹ، فریب، مکاری اور بدعنوانی کے تاریک بادل چھٹ جائیں گے اور پاکستان کے عوام اپنی تقدیر کے خود مالک ہوں گے۔

(الفتح 2 جون تا 5 جولائی 1973ء)

موجودہ بحران معاشی، سماجی اور سیاسی ہے

انٹرویو: وھاب صدیقی

جناح ہسپتال کے اسپیشل وارڈ کے گراؤنڈ فلور کے آخری سرے پر بنے ہوئے کمرے کی تمام کھڑکھیاں بند تھیں اوران پر گہرے رنگ کے پردے گرے ہوئے تھے۔کمرے کے دونوں اطراف مسلح پہرہ تھا۔ہم خاموشی سے کمرے میں داخل ہوگئے۔کمرے کی سامنے والی دیوار پر لگا ہوا کم طاقت کا بلب زردی مائل روشنی پھیلا رہا تھا۔اس مدھم روشنی نے عجب سا سوگوار ماحول پیدا کرر کھا تھا،لیکن سامنے والی دیوار کے پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھی ہوئی بلند قامت اور عظیم جُثّہ والی شخصیت اس سوگوار اور بیزار ماحول سے مطلق متاثر دکھائی نہیں دے رہی تھی۔اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔بلوچی طرز کی گھنیری داڑھی جس میں بڑی نفاست سے کنگھی کی ہوئی تھی۔بڑی بڑی سفید کلدار مونچھیں، چوٹیا نما سر کے بال جن کومہندی سے رنگا گیا تھا۔چہرہ سرخ وسپید، جس پر تاریک شیشوں کی عینک لگی ہوئی تھی۔موٹے کھدر (جوشاید مچھ جیل کا بنا ہوا تھا) کا لباس اور پاؤں میں بلوچی چپل غرضیکہ بلوچ ثقافت اور روایات کا جیتا جاگتا نمونہ یہ شخصیت تھی۔شیر محمد مری۔

شیر محمد مری، یہ نام والدین نے رکھا تھا،حکمران طبقات ''جنرل شیروف'' کہتے ہیں، بلوچ نوجوان نسل انہیں ''بابو'' کے نام سے پکارتی ہے۔''بابو'' ان کی ''خفیہ عرفیت'' تھی اور یہ نام اس وقت دیا گیا تھا جب وہ گوریلا تھے اور ایوبی فوجی آمریت کے خلاف مسلسل جدوجہد کر رہے تھے۔شیر محمد مری کو ''جنرل شیروف'' یا ''بابو'' یا ''شیرو'' کہہ کر مخاطب کیا جائے بُرا نہیں مانتے، کیونکہ ان کا کہنا ہے کہ ''میری زندگی کا مشن سماج کو بدلنا ہے، میں ایسا سماج چاہتا ہوں کہ جہاں انسان کے ہاتھوں انسان لوٹ کھسوٹ کا شکار نہ ہو۔جہاں مظلوم اور کچلے ہوئے طبقات اور چھوٹے صوبوں کے باشندوں کا استحصال نہ ہو۔جہاں دار اور نادار نہ ہوں۔ایسا معاشرہ

قائم کرنا چاہتا ہوں کہ جہاں محبت ہو، خوشحالی ہو، ہر ایک کو یکساں سیاسی، معاشی، ثقافتی آزادیاں حاصل ہوں۔ جہاں سب کو مساوی حقوق ملتے ہوں، یہ ہے میرا مشن اور مقصد۔ اس کیلئے میں تمام عمر جدوجہد کرتا رہا ہوں اور جب تک ایک سانس بھی باقی ہے جدوجہد کرتا رہوں گا۔ میری اس جدوجہد کو حکمران اور گماشتہ طبقات خواہ کوئی سا بھی نام دیں مجھے کسی بھی نام سے پکاریں، مجھے کوئی پرواہ نہیں، میں شرمسار یا شرمندہ نہیں''۔ شاید وہ اس کہاوت کے قائل ہیں کہ ''گلاب کے پھول کو کوئی بھی نام دے دیا جائے، اس کی خوشبو میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔''

شیر محمد مری، حیدرآباد سازش کیس کے ایک ملزم ہیں۔ گذشتہ دنوں آنکھوں کے علاج کیلئے انہیں جناح ہسپتال لایا گیا تھا۔ جب ہم ان سے ملے تو آنکھ کی سوجن تو ختم ہو چکی تھی البتہ سرخی برقرار تھی اور دائیں آنکھ سے دھندلا نظر آتا تھا۔

طوق وسلاسل اور اسیری شیر محمد مری کیلئے کوئی نئی بات نہیں۔ جب ہندوستان پر برطانیہ کا راج تھا اس وقت بھی شیر محمد مری پابند سلاسل ہوئے تھے۔ ان پر تاج برطانیہ کے خلاف تقریر کرنے اور لوگوں کو بغاوت پر اکسانے کا الزام تھا۔ گرفتاری کے بعد انہیں سبی جیل میں رکھا گیا، جہاں ان سے روزانہ 18 سیر آٹا پسوایا جاتا تھا۔ انہیں ایف سی آر کی جس دفعہ کے تحت گرفتار کیا گیا تھا، اس میں ''جرم'' ثابت کئے بغیر ملزم کو تین سال کیلئے جیل میں بند کر دیا جاتا تھا۔ تین سال پورے ہونے کے بعد ملزم سے ''نیک چلنی'' اور ''تاج برطانیہ کے خلاف تقریر نہ کرنے'' کی ضمانت طلب کی جاتی تھی۔ اگر ملزم ضمانت دے دیتا تو رہا کر دیا جاتا، ورنہ مزید تین سال کیلئے پابند سلاسل کر دیا جاتا۔ جو ضمانت نہ دیتا، اس کی مدت اسیری میں اضافہ ہوتا رہتا جو 60 سال تک ہو سکتی تھی۔ تین سال مکمل ہونے کے بعد شیر محمد مری سے کہا گیا کہ ''اگر برطانوی حکومت کی خلاف تقریر نہ کرنے کی ضمانت دو تو تمہیں رہا کر دیا جائیگا۔'' لیکن انہوں نے ضمانت دینے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ مدت اسیری میں تین سال کی توسیع کر دی گئی۔ جب پاکستان بنا تو شیر محمد مری سبی جیل میں تھے۔ قیام پاکستان کے چند ماہ کے بعد انہیں رہا کیا گیا۔ تو ملک آزاد ہو چکا تھا لیکن بنیادی ڈھانچہ وہی تھی۔ فرق صرف اتنا پڑا تھا کہ سفید فام حاکموں کی جگہ کالے حاکموں نے لے لی تھی۔ ان حکمرانوں کو بھی شیر محمد مری کا ''چال چلن'' پسند نہیں آیا۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد ایک ہندو کو قتل کرنے کے مبینہ الزام میں انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ عدالت میں مقدمہ چلا، حکومت الزام ثابت نہ کر سکی اور عدالت نے شیر محمد مری کو رہا کر دیا۔

Scanned with CamScanner

انگریز حکمران برصغیر سے جاتے ہوئے شیر محمد مری کی فائل پر ''خطرناک'' لکھ گیا تھا اور غلام ذہنیت کے پاکستانی حاکم انگریزوں کے لکھے ہوئے کو ''وحی الہٰی'' سمجھتے تھے۔ چنانچہ اکتوبر 1958ء سے پیشتر ہر سال شیر محمد مری کو ایف سی آر کے تحت گرفتار کیا جاتا اور گیارہ برسوں میں کوئی سال بھی ایسا نہ گذرا جس میں انہوں نے جیل یاترا نہ کی ہو۔

اکتوبر 1958ء میں ایوب خان نے مارشل لاء نافذ کیا، مارشل لاء کے نفاذ کو ایک ماہ بھی نہ گذرا تھا کہ شیر محمد مری کو صوبہ بدر کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ انہوں نے نواب شاہ (سندھ) میں گذارا، اس کے بعد پشاور چلے گئے۔ پشاور میں انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ الزام تھا کہ انہوں نے نواب شاہ میں ''ملک کی سالمیت'' کے خلاف تقریر کی تھی۔ لیکن عدالت نے انہیں رہا کر دیا۔ اس کے بعد وہ نواب شاہ آ گئے تو یہاں بھی گرفتار کئے گئے۔ الزام وہی تھا البتہ مقام کا فرق تھا۔ استغاثہ میں کہا گیا کہ ''ملزم نے پشاور میں ملک کی سالمیت کے خلاف تقریر کی تھی''۔ مقدمہ ہائی کورٹ میں چلا۔ اور عدالت عالیہ نے انہیں ضمانت پر رہا کر دیا۔ دور ایوبی میں بلوچستان کے عوام پر جو کچھ بیتی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ بلوچستان میں فوجی کاروائی کی گئی۔ متعدد بلوچ عوام نے ہتھیار اٹھا لئے۔ شیر محمد مری بھی پہاڑوں پر چلے گئے اور گوریلا بن کر ریاستی طاقت کا مقابلہ کیا۔ وہ 8 جون 1963ء کو پہاڑوں پر گئے تھے اور مئی 1970ء میں اترے۔ اس وقت تک ایوبی آمریت کا دور ختم ہو چکا تھا اور مسند اقتدار پر دوسرا فوجی آمر یحیٰی خان براجمان تھا۔

یہ تھا ایک مختصر سا تعارف اب شیر محمد مری کا انٹرویو ملاحظہ فرمایئے جو انہوں نے خصوصی طور پر ''الفتح'' کو دیا۔

الفتح: آپ کو ''جنرل شیروف'' کے نام سے متعارف کروایا گیا ہے اور اس کے ساتھ بڑی لمبی چوڑی داستان بھی وابستہ کی گئی ہے اس میں کہاں تک صداقت ہے؟

شیرو: جب اخبارات میں مجھے ''جنرل شیروف'' کے نام سے متعارف کرایا گیا اور داستانیں گھڑی گئیں اس وقت میں جیل میں تھا۔ یہ مارچ 1973ء کا زمانہ تھا، میں کراچی میں زیر حراست تھا اور سات ٹیمیں ایک سرحد، ایک پنجاب، ایک بلوچستان اور سندھ اور وفاقی ٹیمیں مجھ سے تفتیش کر رہی تھیں۔ اس زمانے میں مجھے اخبارات نہیں دیئے جاتے تھے اس لئے میں اقرار یا انکار کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔

الفتح: اخبارات میں کہا گیا تھا کہ آپ کا تعلق سوویت لابی سے ہے اور آپ ماسکو سے اتنے

Scanned with CamScanner

متاثر ہیں کہ خود کو ''جنرل شیروف'' کہلواتے ہیں۔ تصویریں بھی شائع ہوئی تھیں جن میں آپ کو گوریلا پلٹن کا معائنہ کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ آپ کی ''بکرا پلٹن'' اور سرکردہ گوریلوں کی تصاویر شائع ہوئی تھیں اور آپ کے پاس بیس ہزار گوریلے ہونے کی اطلاع بھی چھپی تھی۔

شیرو: ''لابی'' سے کیا مراد ہے؟ اگر اس کا مطلب ایجنٹ ہے تو میں کسی طاقت یا ملک کا ایجنٹ نہیں۔ میرا تعلق عوام کی لابی سے ہے۔ مظلوم عوام کی لابی سے۔ آپ مجھے مظلوم اور محروم طبقات کا ایجنٹ کہہ سکتے ہیں۔ میں اپنے کیے پر شرمندہ نہیں۔ میری زندگی کا مشن چھوٹے صوبوں کے عوام اور ملک بھر کے مظلوم طبقات کو استحصال سے نجات دلانا ہے۔

یہ اگر ''جرم'' ہے تو اس پر مجھے فخر ہے۔ میرا نام شیر محمد مری ہے لیکن بلوچ ثقافت میں کبھی پورے نام سے مخاطب نہیں کیا جاتا۔ صرف خیر بخش مری مجھے شیر محمد مری کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ باقی تمام لوگ ''شیرو'' کہتے ہیں۔ بلکہ میں دستخط میں بھی ''شیرو'' لکھتا ہوں۔ اور ''جنرل شیرو'' اس لئے کہتے ہیں کہ میں گوریلا تھا اور ایوب آمریت کے خلاف مسلح جنگ کی تھی۔ مگر ''جنرل شیرو'' کے آگے ''ف'' کیوں لگایا گیا، یہ تو حکمران طبقات یا اخبارات ہی بتا سکتے ہیں۔ ویسے آپ کی اطلاع کیلئے بتا دوں کہ میں کبھی روس نہیں گیا۔ البتہ وہاں جانے کی خواہش ضرور ہے تاکہ لینن کو دیکھ سکوں اسی طرح چین جانے کی خواہش ہے تاکہ ''ماؤ'' کو دیکھ سکوں (مسکراتے ہوئے) اگر چین گیا تو پھر مجھے مجھے ''جنرل شیروچ'' کا نام دیا جائے گا۔

جہاں تک تصویروں کا تعلق ہے۔ وہ حقیقت پر مبنی تھیں۔ لیکن یہ ایوب خان کے زمانے کی تھیں۔ جب میں نے مسلح جدوجہد کی تھی۔ ان تصویروں کا تعلق پیپلز پارٹی کے دورِ حکومت سے نہ تھا۔ مجھے میرے گھر سے گرفتار کیا گیا تھا۔ گوریلوں کی تعداد حکومت ہی بتا سکتی ہے۔ ہالہ کانفرنس میں بھٹو صاحب نے پانچ ہزار تعداد بتائی تھی۔ جو 1973ء کے اوائل میں حکومت کے مطابق بیس ہزار ہوگئی۔

الفتح: آپ کہتے ہیں کہ آپ کا تعلق کسی سیاسی جماعت سے کبھی نہیں رہا۔ لیکن ملکی سیاست اور خصوصاً بلوچستان کی سیاست میں آپ سرگرم عمل رہے ہیں۔ عام طور پر لوگ آپ کو کالعدم نیپ سے وابستہ سمجھتے ہیں۔ حقیقت حال کیا ہے؟

شیرو: میں کبھی سیاسی جماعت کا رکن نہیں رہا، کیونکہ میں سیاسی پارٹیوں پر نہیں عوام پر یقین رکھتا ہوں۔ آج تک پاکستان کی تمام جماعتوں سے میرا نظریاتی اختلاف رہا ہے۔ اور اب بھی ہے۔ جب مجھے ملک کی سیاست پر کوئی رائے دینی ہوتی تو میں کالعدم نیپ کا پلیٹ فارم استعمال کرتا تھا۔ کیونکہ صرف کالعدم نیپ ہی واحد جماعت تھی جو منشور اور لفاظی کی حد تک قومیتوں، سیکولرازم اور سوشلزم کی حامی تھی۔ یہ حمایت صرف کاغذ پر تھی، عملاً نہیں۔ جب کہ دیگر سیاسی جماعتیں الفاظ کی حد تک بھی قومیتوں اور سیکولرازم کی حامی نہیں تھی۔

الفتح: کسی سیاسی جماعت میں شامل ہوئے بغیر سیاسی عمل میں شرکت کی افادیت کے بارے میں آپ کا تجربہ کیا کہتا ہے؟

شیرو: میری پارٹی چھوٹے صوبوں کے عوام اور دوسرے مظلوم طبقات ہیں اور عوام میں کام کرنے اور ان کی خدمت کیلئے کسی سیاسی پارٹی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بغیر نام کے بھی آپ عوام کی خدمت کریں تو عوام آپ پر اعتماد کریں گے۔ اصل چیز عوام کا اعتماد ہے۔ اور میرا تجربہ بتاتا ہے کہ عوام پاکستان کی موجودہ سیاسی جماعتوں پر اعتماد نہیں کرتے۔ آپ عوام کیلئے کام کریں تو کسی پارٹی کے کارکن ہوئے بغیر عوام آپ کی عزت کریں گے۔ میں نے ایوبی آمریت کے خلاف جدوجہد کی اور جب مئی 1970ء میں پہاڑوں سے اترا تو نہ صرف بلوچستان کے باشندوں نے بلکہ ملک بھر کے مظلوم طبقات نے میرا خیر مقدم کیا۔

الفتح: بلوچ عوام کی جدوجہد کے بارے میں ایک طبقے کی رائے ہے کہ یہ پاکستان سے علیحدگی کی تحریک ہے آپ کی کیا رائے ہے؟

شیرو: عوام کی جدوجہد ہمیشہ سامراج، ذیلی سامراج (سب امپریلزم)، علاقائی سامراج، اور اس کے گماشتوں کے خلاف ہوتی ہے۔ یہ لڑائی بہت طویل اور کٹھن ہوتی ہے اور عوام کے تعاون سے لڑی جاتی ہے۔ اس کیلئے کوئی بھی ذی ہوش اور باشعور بلوچ یہ تصور نہیں کرسکتا کہ سات کروڑ پاکستانی عوام کی قوت سے کٹ کر صرف 25 لاکھ افراد سے عالمی سامراج اور اس کے گماشتوں سے لڑا جاسکتا ہے۔ ہر بلوچ سمجھتا ہے کہ پاکستان کا ہر بھوکا پیاسا چھوٹے صوبوں کے مظلوم عوام اور ملک کے تمام مظلوم طبقات اس کے ساتھ ہیں، حمایتی ہیں اور سامراج دشمن ہیں۔ چنانچہ ہم پاکستان کے مظلوم عوام سے علیحدگی کا تصور

Scanned with CamScanner

تک نہیں کر سکتے۔ علیحدگی کی تحریک طالع آزماؤں کی ذہنی اختراع اور تخلیق ہے۔

الفتح: بعض حلقے بلوچ عوام کی جدوجہد کو سرداری نظام کی بقاء کی جدوجہد کہتے ہیں؟

شیرو: سرداری نظام کوئی چیز نہیں دراصل نظام قبائلی ہوتا ہے اور قبائلی جنگ ہمیشہ قبائل کے درمیان ہوتی ہے۔ پاکستان قبائلی ریاست نہیں ہے۔ اس لئے بلوچستان کی جدوجہد کو قبائلی جنگ نہیں کہا جاسکتا۔ اگر یہ سرداروں کی جنگ تھی تو ایک سو سے زیادہ سردار پیپلز پارٹی کے ساتھ تھے۔ صرف دو سردار نیپ میں تھے جو گرفتار کر لئے گئے۔ اس کے باوجود جنگ بند کیوں نہیں ہوتی۔ اب کیوں ہو رہی ہے؟ جب کہ کالعدم نیپ کا ایک سردار ضمانت پر رہا ہو چکا ہے اور دوسرے کی ضمانت منظور ہو چکی ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آج کا باشعور نوجوان بلوچ سرداروں کی بقاء کیلئے لڑے گا، اپنے گھر جلوائے گا اور اپنے پیاروں کی لاشیں اٹھائے گا؟ یہ نادار عوام کی استحصالی طبقات کے خلاف جنگ ہے۔

الفتح: بلوچستان کی جدوجہد کو ملک کے دوسری علاقوں سے کس حد تک حمایت ملی؟

شیرو: بلوچستان کی جدوجہد پورے ملک کے مظلوم اور کچلے ہوئے عوام بلکہ دنیا بھر کے تمام مظلوم طبقات اور چھوٹے علاقوں کے باشندوں کی جدوجہد ہے، اس لئے ہمیں ملک بھر سے حمایت ملی۔ پورے پاکستان کے مظلوم عوام ہمارے ساتھ ہیں۔

الفتح: بلوچستان کی جدوجہد کو دوسرے علاقوں کی جدوجہد سے کس طرح جوڑا جاسکتا ہے؟

شیرو: جدوجہد کی صرف ایک شکل نہیں ہوتی، وہ مختلف شکلوں میں لڑی جاتی ہے۔ بلوچستان میں مسلح جدوجہد ہو رہی تھی تو دیگر علاقوں میں بھی مظلوم عوام اور طبقات خاموش نہیں بیٹھے۔ وہ بھی جدوجہد کر رہے ہیں۔ پنجاب، سندھ اور سرحد کے طلباء، مزدور، ترقی پسند دانشور بلوچستان میں ہونے والے مظالم کے خلاف سراپا احتجاج ہیں۔ وہ پمفلٹ شائع کرتے ہیں۔ پوسٹر لگاتے ہیں۔ اخبارات میں بیانات دیتے ہیں۔ بلوچستان کی جدوجہد کی حمایت کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ بلوچستان کی جدوجہد دوسرے علاقوں سے جڑ چکی ہے اور گذرتے وقت کے ساتھ چھوٹے صوبوں کے باشندوں اور مظلوم طبقات کا اتحاد مزید مضبوط ہو جائے گا کیونکہ سب کا مقصد مشترکہ ہے، سب ایک ہی منزل کے راہی ہیں۔ وہ منزل لوٹ کھسوٹ سے پاک معاشرہ کی تعمیر ہے۔

الفتح: غیر منتخب حکومت کی طرف سے احتساب کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

شیرو: میرے خیال میں تو پاکستان کی تیس سالہ تاریخ میں ایک بھی حکومت ایسی نہیں آئی جسے منتخب کہا جاسکے۔ خود پیپلز پارٹی کا انتخاب پاکستان کے دو ٹکڑے کرنے کا انتخاب تھا۔ احتساب سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟ اگر اس سے مراد فرد کا احتساب ہے اور وہ فرد بھٹو ہے تو میں بھٹو کو مافوق الفطرت شخص نہیں سمجھتا۔ وہ جاگیردار ہے، ان کا نمائندہ ہے اور جاگیردار طبقہ سامراج کا حاشیہ بردار ہوتا ہے اور اس کے مفادات کا محافظ ہوتا ہے۔ میرے خیال میں صحیح احتساب، بھٹو کے محاسبہ سے ممکن نہیں، احتساب ریاست کے جبر و تشدد کا ہونا چاہیئے۔

الفتح: اس کا مطلب ہے کہ آپ 1970ء کے الیکشن کو بھی نہیں مانتے اور ''ریاست اور ریاستی جبر و تشدد'' یہ وہی نظریہ ہے جو لینن نے پیش کیا ہے؟

شیرو: 1970ء میں بلاشبہ الیکشن ہوا تھا لیکن اس کے نتائج کو تسلیم نہیں کیا گیا اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ 1970ء کے الیکشن میں نہ شیخ مجیب کامیاب ہوا تھا اور نہ عوامی لیگ! مغربی پاکستان میں نہ بھٹو کامیاب ہوا تھا نہ پیپلز پارٹی بلکہ مشرقی پاکستان میں ''پٹی بورژوا'' کامیاب ہوا تھا اور مغربی پاکستان میں جاگیرداری جیتی تھی۔ اگر اس الیکشن کے نتائج کو تسلیم کرلیا جاتا اور اقتدار ''پٹی بورژوازی'' کے نمائندے مجیب کو دے دیا جاتا تو نہ صرف جاگیرداری نظام کو خطرہ تھا بلکہ ریاستی مشینری کی اس گندی طاقت کو بھی خطرہ تھا جس کی اس ملک میں اجارہ داری ہے۔ سامراجی مفادات کو بھی خطرہ لاحق تھا۔ چنانچہ جاگیردار اور ریاست کی گندی طاقت کی اجارہ داری کو بچانے کیلئے ملک کے دو ٹکڑے ہونا لازمی تھا یہی کچھ کیا بھی گیا۔

''ریاست'' اور ''ریاستی جبر و تشدد'' سے میری مراد وہی نظریہ ہے جو لینن نے پیش کیا تھا۔ اس لئے نہیں کہ اسے لینن نے پیش کیا تھا بلکہ لینن کی رائے ایک تاریخی حقیقت ہے۔ انسانی ارتقاء کی تاریخ گواہ ہے کہ ریاست ناقابل حل تضادات کو معتدل بنانے کیلئے وجود میں آتی ہے۔ پاکستان ایک کثیر الاقوامی ریاست تھی اور ہے، یہاں پر چھوٹے صوبوں کے عوام اور مظلوم طبقات کو ہمیشہ جبر سے دبایا گیا۔ یہ جبر کراچی، لاہور اور فیصل آباد میں مزدوروں سے کیا گیا۔ طلباء سے کیا گیا، ملک بھر کے کسانوں سے کیا گیا اور اب تیسری بار بلوچستان کے عوام کے ساتھ کیا جارہا ہے۔

الفتح: موجودہ صورت حال کیا ہے؟ آپ کی رائے میں ترقی پسند اور جمہوریت دوست طاقتوں

Scanned with CamScanner

کو کیا پالیسی اختیار کرنی چاہئے؟

شیرو: بعض حلقے موجودہ بحران کو آئینی بحران قرار دیتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ آئینی بحران نہیں، کیونکہ پاکستان میں نہ کبھی آئین تھا اور نہ ہے۔ اس ملک میں ہمیشہ فردِ واحد کی زبان آئین کا درجہ رکھتی ہے۔ بڑی دوڑ بھاگ کے بعد ایک متفقہ آئین بنایا گیا۔ سب سے دستخط لئے گئے، لیکن دستخط کے فوراً بعد دستخط کرنے والے گرفتار کر لئے گئے اور بنیادی حقوق معطل کر دئے گئے۔ آئینی بحران کا شور مچانے والے سامراج، ذیلی سامراج اور استحصالی طبقات کے نمائندے ہیں اور وہ آئین کی دہائی دے کر چھوٹے صوبوں کے عوام اور استحصال زدہ طبقات کو گمراہ کر کے اپنے اور سامراج کے مفادات کا تحفظ کرنا چاہتے ہیں۔

میرے خیال میں موجودہ بحران معاشی، سماجی اور سیاسی ہے اور جب یہ تینوں بحران یکدم جنم لیتے ہیں تو انقلابی بحران بن جاتے ہیں۔ تاریخ کا رجحان ہی نہیں بلکہ فیصلہ ہے کہ قومیں خودمختاری چاہتی ہیں اور عوام انقلاب چاہتے ہیں۔ جو طبقاتی سیاست کے بغیر خالص نیشنلزم کی بات کرتے ہیں، فاشسٹ ہوتے ہیں۔ جو مزدور کو سیاست سے دور رکھنے کی بات کرتے ہیں وہ ٹریڈ یونینسٹ ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں ترقی پسند اور جمہوریت دوست طاقتوں کو چاہئے کہ وہ چھوٹے صوبوں کے عوام کو خودمختیاری اور مظلوم طبقات کے حقوق کے حصول کو اپنا بنیادی نصب العین بنا کر عوامی جمہوریت کیلئے جدوجہد کریں۔

الفتح: آپ ترقی پسند سیاست کو قبائلی نظام سے کس طرح مربوط کریں گے؟

شیرو: ترقی پسند سیاست کو قبائلی نظام میں کس طرح جوڑا گیا اس کا ثبوت بلوچستان کے عوام کی جدوجہد ہے جو چھوٹے صوبوں کے عوام کے حقوق اور مظلوم طبقات کیلئے لڑ رہے ہیں۔

الفتح: آپ کو اپنی جدوجہد کے دوران مختلف حکومتوں سے سابقہ پڑا۔ ان کے رویہ میں کیا بنیادی فرق تھا اور موجودہ رویہ کیا ہے؟

شیرو: کوئی فرق نہیں پڑا۔ بنیادی تبدیلی کیا معمولی رد و بدل تک نہیں ہوئی۔ صرف چہرے بدل گئے ہیں۔

الفتح: آج کل کہا جا رہا ہے کہ بلوچستان میں صورت حال معمول پر لائی جا رہی ہے۔ کیا یہ بات درست ہے؟

Scanned with CamScanner

شیرو: میں اسیر ہوں مجھے کیا خبر، لیکن اسیری اس بات کا ثبوت ہے کہ صورت حال معمول پر نہیں لائی جارہی ہے۔ جب آئے گی تو پتہ چلے گا۔ ویسے میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ رویہ وہی ہے جو پہلے تھا۔

الفتح: آپ کے خیال میں موجودہ اور سابقہ بحرانوں کے اسباب کیا ہیں اور ان پر کس طرح قابو پایا جاسکتا ہے؟

شیرو: موجودہ بحران کو سابقہ نہیں کہہ سکتا۔ دراصل ایسے بحران ہماری قوم کا مقدر بن چکے ہیں۔ جو ہر پانچ سات سال کے بعد آتے ہیں۔ ریاستی جبر و تشدد سے چھوٹے صوبوں کے عوام اور ملک بھر کے مظلوم طبقات کو دبایا جاتا ہے اور تضادات کو معتدل بنانے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن تضادات نا قابل حل ہیں۔ اس لئے جب یہ سر اٹھاتے ہیں تو بحران پیدا ہو جاتا ہے اور اس کا حل صرف یہ ہے کہ چھوٹے صوبوں کے عوام کو خود مختاری دی جائے۔ مظلوم طبقات کو حقوق دیئے جائیں۔ نفرتوں کو محبت میں بدلا جائے۔ مزدوروں اور کسانوں اور چھوٹے صوبوں کے عوام کے باہمی بنیادی مشورے بلکہ ان کی رہنمائی حاصل کی جائے۔ ہر بنیادی اور اہم فیصلے میں ان سے رائے اور رہنمائی لی جائے۔ صرف اسی صورت میں بحران پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

(ہفت روزہ ''الفتح'' کراچی 30 دسمبر 77 تا 6 جنوری 1978ء)

بلوچستان کا سکوت طوفان کی آمد کی خبر دے رہا ہے

انٹرویو: مجاهد بریلوی

مری ہاؤس کے بڑے سے پھاٹک سے داخل ہوتے ہی ایک گھیرے میں خیر بخش مری اور شیر محمد مری بیٹھے نظر آتے ہیں۔ شام خاصی ہو چکی ہے جس کے ساتھ ہی فضا میں خنکی بڑھ رہی ہے مگر لوگوں کے آنے کا سلسلہ جاری ہے جو اپنے روایتی انداز میں ''حال'' کہہ رہے ہیں اور پوچھ رہے ہیں۔ میرے برابر بیٹھا ہوا ایک ''مری'' جس کا جسم میل سے سیاہ ہو رہا تھا اور جو اپنے پھٹے ہوئے بوسیدہ کپڑوں میں سردی سے کانپ رہا تھا اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے چھ سات سالہ لڑکے کو خیر بخش مری سے ملاتے ہوئے کہتا ہے ''سردار یہ تمہارے راستے پر چلے گا اسے دعا دو'' خیر بخش مری اُس کے جسم سے جھانکتی غربت کو اپنی آنکھوں میں جذب کرتے ہوئے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہتے ہیں ''بابا سردی بڑھ رہی ہے اب گھر جاؤ''

شیر محمد مری مجھ سے کہتے ہیں ''کوئٹہ سے ذرا پہاڑوں کے اس طرف نکل جائیں پورا بلوچستان اس شخص سے مختلف نظر نہیں آئے گا۔'' خیر بخش مری سے میں اگلے روز کا وقت لے کر شیر محمد مری کے ساتھ ''مری ہاؤس'' سے ملحق ایک کمرے میں آجاتا ہوں۔ گفتگو کے بہاؤ کو میں انٹرویو کی شکل دیتا ہوں۔

نہایت نفاست سے سنہرے، سیاہ اور سفید بڑے بڑے بالوں میں سے جھانکتے سرخ توانا چہرے پر کرختگی سے پہلی نظر میں جو رائے قائم ہوتی ہے وہ اس شیر محمد مری سے بہت مختلف ہے جو بلوچستان کے ''کرب و آلام'' کے دنوں کو اپنے شگفتہ اور دھیمے لہجے میں بیان کر رہا ہوتا ہے شیر محمد مری کو انکے دوست اور احباب ''شیرو بابو'' کہتے ہیں۔ حکومت اور اخبار نے انہیں ''جنرل شیروف'' کا نام دیا ہے لیکن وہ خود اپنا پورا نام شیر محمد مری کہلوانا پسند کرتے ہیں لہذا میں

بھی انہیں شیر محمد مری ہی کہہ کر مخاطب کر رہا ہوں۔ سوالوں کے جواب میں انکی زبان، انکا لہجہ عام سیاسی رہنماؤں سے مختلف ہے، انکی اس تنبیہہ کے باوجود کہ "یہ سب کچھ تم چھاپو گے کیسے" سوالوں کے جواب میں میرا قلم تیزی سے چل رہا ہے۔

سوال: بلوچستان کے بارے میں عبوری حکومت کی جانب سے اب تک جو اقدامات کئے گئے ہیں کیا اس سے صورتحال معمول پر آ رہی ہے؟

جواب: ہمیں اس وقت صرف اتنا معلوم ہے کہ حیدرآباد اسپیشل ٹریبونل توڑ دیا گیا ہے اور ہم رہا کر دیئے گئے مگر آج جب ہم پانچ سال بعد جیل سے باہر آئے ہیں تو چاروں طرف سے "بارود" کی بو آ رہی ہے۔ جو کچھ ماضی میں ہوا ہے اسکی پاکستان کی تاریخ میں مثال ملنی مشکل ہے، بلوچوں کے گھروں کو تہس نہس کر دیا گیا۔ مردوں کا قتل عام ہوا، عورتوں کی عصمتیں محفوظ نہیں رہیں اور معصوم بچوں کو بیچا گیا۔ یہ سب کچھ پاکستان کے ایک صوبے میں اسلام کے نام پر ہوا۔ آپ کہتے ہیں کہ ہماری رہائی سے یا عام معافی کے اعلان سے حالات معمول پر آ رہے ہیں بلکہ بعض خوش فہم تو یہ تک کہہ رہے ہیں کہ "بلوچستان کا سیاسی مسئلہ حل ہو چکا ہے" یہ ہمارے ساتھ ایک خوفناک مذاق ہے، بلوچستان کے عوام نے صرف ہماری رہائی کے لئے قربانیاں نہیں دی تھیں۔ وہ چند بنیادی اصول اور سیاسی و معاشی حقوق تھے جس کے لئے اتنی قربانیاں دی گئیں، اسی لئے میں یہ کہتا ہوں کہ "مسئلہ" ابھی حل نہیں ہوا ہے۔ وقتی طور پر ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ بلوچستان میں سکوت ہے اس کے پیچھے طوفان آ رہا ہے اسکی دھمک وہ لوگ جو سیاسی طور پر بالغ ہیں محسوس کر سکتے ہیں۔

سوال: کیا بلوچستان کے مسائل پاکستان کے مسائل سے مختلف ہیں؟

جواب: یہ تو ایک حقیقت ہے کہ بلوچستان پاکستان کا ایک حصہ ہے اور اصولی طور پر بلوچستان کے وہی مسائل ہونے چاہئیں جو پاکستان کے دیگر صوبوں کے عوام کو درپیش ہیں مگر ایسا نہیں ہے۔ بلوچستان کے مسائل پاکستان کے مسائل سے اس اعتبار سے مختلف اور منفرد ہیں کہ ۳۰ سال گذرنے کے باوجود بلوچستان کے عوام کے ساتھ دوسرے بھی نہیں تیسرے درجے کے شہری کا سلوک کیا جاتا رہا۔ انگریز کے دور میں تو ہم برطانوی سامراج کی نوآبادی تھے، مگر پاکستان میں رہ کر بھی بلوچستان کو ایک "نوآبادی" کی

Scanned with CamScanner

حیثیت ہی حاصل رہی۔ جو بھی شہری اور فوجی حکومت برسر اقتدار آئی اس نے اپنا نشانہ بلوچستان کو بنایا۔ تیس سال کے عرصے میں یہاں تیسری بار فوجی آپریشن ہو رہا ہے۔ پھر یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ اس صوبے کے عوام کو جنہوں نے رضا کارانہ طور پر پاکستان میں شمولیت اختیار کی تھی آزادی کے ۲۳ سال تک ''بے نام'' رہے۔ یہ بلوچستان کی سرزمین تھی یہاں بلوچ رہتے تھے مگر نہ ہم خود کو بلوچ کہہ سکتے تھے اور نہ ہی اپنے صوبے کو بلوچستان۔ خود غور کیجئے حضور کہ یہ کتنی بڑی ستم ظریفی تھی، سندھ کے عام خود کو سندھی بھی کہیں اور اپنے صوبے کو سندھ بھی، پنجاب کے عوام خود کو پنجابی بھی کہیں اور اپنے صوبے کو پنجاب بھی لیکن بلوچ نہ تو خود کو بلوچ کہہ سکیں اور نہ اپنے صوبے کو بلوچستان، ایسی صورت میں یہاں کے عوام میں احساس محرومی اور تلخی کا پیدا ہونا ایک فطری عمل تھا۔ آپ مجھ سے بلوچستان کے حقیقی مسائل کے بارے میں پوچھ رہے ہیں اس کا صرف ایک جواب ہے کہ ہمیں ہمارے صوبے میں ایک آزاد شہری کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا گیا بلکہ حکمرانوں نے ہم سے طاقت کی زبان میں بات کی۔ یہ مسئلہ کل کی طرح آج بھی اپنی پوری سنگینی کے ساتھ موجود ہے جس سے نہ تو راہ فرار اختیار کی جاسکتی ہے اور نہ ہی مختلف حیلوں بہانوں سے ہمیں بہلایا جاسکتا ہے۔

سوال: بلوچستان کے سیاسی مسئلے میں اب کیا رکاوٹ ہے۔ اور یہ رکاوٹ اندرونی ہے یا بیرونی؟

جواب: میں اندرونی یا بیرونی رکاوٹوں کو مختلف نہیں سمجھتا ہمارے ملک میں تبدیلیاں آتی نہیں بیرونی اشارے پر لائی جاتی ہیں، اصل مسئلہ بلوچستان کی وہ وسیع و عریض زمین اور اسکے بے پناہ وسائل ہیں جس پر سامراجی ملکوں کی نظریں لگی ہوئی ہیں، وہ ہماری سرزمین پر قبضہ کر، کے یہاں کے وسائل کو اپنے مفادات کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ پھر سامراجیوں کے یہ بھی عزائم ہیں کہ بلوچستان کے عوام کو یکسر انکے حقوق سے محروم کردیں بلوچستان کے تیل اور یہاں کے معدنی ذخائر پر کنٹرول کرنے کے منصوبے بہت پرانے ہیں مگر ہم اپنی جغرافیائی اہمیت سے بھی آگاہ ہیں اور اپنے حقوق کا احساس بھی رکھتے ہیں اس لئے سامراجی ممالک اپنے ایجنٹوں کے ذریعے تمام وسائل اور طاقت کو بروئے کار لانے کے باوجود بھی اپنے عزائم میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔ گذشتہ تیس سال سے مسلسل ہم ایک ایسی بحرانی کیفیت سے گذر رہے ہیں جو کبھی

Scanned with CamScanner

اوپری سطح پر تیز نظر آتی ہے اور کبھی نہایت دھیمی۔

سوال: تو پھر اس مسئلے کا کیا حال ہوگا؟

جواب: یہ بات تو طے ہے کہ کوئی اندرونی یا بیرون طاقت ''گولی'' کے ذریعے اس مسئلے کو حل نہیں کرسکتی۔ رہا بلوچستان کے مسئلے کا حل تو وہ نہایت سیدھا سادہ ہے یعنی قومیتوں کو انکے حقوق دیں اور غریب محنت کش عوام کو اقتدار میں بھرپور شرکت۔!

سوال: ۱۹۷۳ء کے آئین میں بلوچستان کو ایک صوبے کی حیثیت سے جو حقوق ملے تھے کیا انہیں بنیاد بنا کر اس مسئلے کو حل نہیں کیا جاسکتا تھا؟

جواب: ۱۹۷۳ء کا آئین بنانے والوں میں جو بھی پارٹیاں شامل تھیں وہ یکے بعد دیگرے جیل گئیں یعنی نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت علمائے اسلام کو دوصوبوں میں حکومت ملی۔ اسکے بعد وہ نہ صرف ان حکومتوں سے محروم ہوئیں بلکہ ایک طویل عرصے تک ۱۹۷۳ء کے آئین ہی کی بعض شقوں کی بنیاد پر اس (نیپ) کے رہنماؤں کو جیلوں میں رکھا گیا پھر بھٹو صاحب اپنے ساڑھے پانچ سالہ دور اقتدار کے بعد نہ صرف یہ کہ حکومت سے محروم ہوئے بلکہ وہ بھی اسی آئین کی رو سے آج کوٹ لکھپت جیل میں ہیں، تو جب اس متفقہ آئین کے بنانے والوں کو ہی ''تحفظ'' نہ مل سکا تو پھر قومیتوں اور غریب طبقے کے لوگوں کا مسئلہ کس طرح حل ہوتا۔ اس لئے یہ کہنا کہ ۱۹۷۳ء کا آئین حرفِ آخر ہے اور اس سے بلوچستان کے عوام کو آئینی تحفظات اور حقوق مل گئے تھے ایک مفروضے سے زیادہ خوش کن نہیں۔ اگر بلوچستان کو صوبائی خودمختیاری مل جاتی تو بلوچستان کا ایک لاکھ تیس ہزار مربع میل کا علاقہ ''خون میں لت پت'' نہیں ہوتا۔ ۱۹۷۳ء کے آئین سے ہمارے صوبے کے عوام کو کون سے معاشی اور سیاسی فوائد حاصل ہوئے، سوئی گیس ہمارے ہاں سے نکل کر پاکستان بھر میں جاتی ہے مگر ایک فٹ بھی یہاں کی زمین پر استعمال نہیں کی جاتی۔ یہاں کا سنگِ مرمر پاکستان کے دیگر صوبوں کے لوگوں کی کوٹھیوں میں آرائش و زیبائش میں استعمال ہوتا ہے مگر اس کا ایک انچ ٹکڑا بھی ہمارے گھروں میں نہیں لگتا، یہاں کی لاکھوں ٹن مچھلی سے کروڑوں روپے سالانہ کمایا جاتا ہے مگر ہمارے لوگ ''غذا'' کو ترستے ہیں۔ بلوچستان کے عوام کو خود انکے اپنے وسائل سے محروم رکھا گیا ہے، اور یہی احساس محرومی کا سبب ہے جسکی وجہ سے ہماری زبان تلخ ہے جو حکمرانوں کو ناگوار

Scanned with CamScanner

گذرتی ہے۔ اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ ۱۹۷۳ء کے آئین سے بلوچستان میں صوبائی خودمختیاری کا مسئلہ حل کر دیا گیا ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ پہاڑ جیسے سنگین مسائل منہ کھولے کھڑے ہیں۔ پاکستان کے دیگر صوبوں میں چند لوگ مارے جائیں، کچھ گولیاں چلیں تو انقلاب آ جاتا ہے مگر یہاں دس سال سے گولی چل رہی ہے مگر کوئی تبدیلی نہیں آتی۔

سوال: پاکستان کا موجودہ بحران کس نوعیت کا ہے؟

جواب: میں اسے سیاسی، معاشی وسماجی بحران سمجھتا ہوں۔ سیاسی اس اعتبار سے کہ یہاں قومیتوں کا شروع ہی سے تضاد رہا ہے، حکمراں استحصالی طبقے نے اپنے مخصوص سامراجی مفادات کے لئے غریب محنت کش عوام اور قومیتوں سے اس قدر شدید نفرت کی ہے کہ وہ آج اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ ۳۰ سال میں اس سرزمین پر اتنے مظالم ڈھائے گئے ہیں کہ برصغیر کی دوسو سالہ برطانوی دور حکومت میں بھی اس کی مثال نہیں ملتی۔ معاشی بحران میں اس اعتبار سے کہتا ہوں کہ معاشی طور پر سامراج کو پاکستان میں اتنا دخل ہے کہ جب تک سامراج کو پاکستان سے دیس نکالا نہ مل جائے معاشی استحکام پیدا ہونا ناممکن ہے۔ پاکستان کی معیشیت سامراجی قرضوں کے بوجھ تلے اتنی دبی ہوئی ہے کہ ایک پاکستانی بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتے ہی ''ڈالروں'' کا مقروض ہو جاتا ہے، پاکستان جیسی نیم جاگیردارانہ، نیم سرمایہ دارانہ اور نیم نوآبادیاتی ریاست میں ہر تین چار سال بعد جو یہ بحران پیدا ہو جاتا ہے وہ اسی معاشی وسیاسی غلامی کا سبب ہے جسے کبھی آئینی اور کبھی ایک فرد کا بحران کہہ دیا جاتا ہے۔ اصل میں یہ انقلابی بحران ہے جو اس ملک کے عوام کا مقصد ہے جب تک کہ اس ملک پر سامراج اور ان کے حواریوں کا غلبہ ختم نہیں ہوتا یہ ''انقلابی بحران'' ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔

سوال: کیا ملک کی موجودہ سیاسی قوتیں اس ''بحران'' کو نکالنے میں کامیاب ہو جائیں گی؟

جواب: بھٹو صاحب نے روٹی، کپڑا، مکان کا نعرہ لگا کر اور قومی اتحاد نے نظام مصطفیٰ کا نعرہ لگا کر اس بحران اور تضاد کو اپنے تئیں معتدل بنانے کی کوشش کی تھی مگر ملک میں موجود یہ تیسرا اکمل مارشل لاء اس بات کو ثبوت ہے کہ پیپلز پارٹی اور قومی اتحاد کے یہ نعرے عوام کے مسائل حل کرنے اور ملک کو سیاسی، معاشی وسماجی بحران سے نکالنے میں ناکام ہو گئے ہیں۔ پاکستان میں ۳۰ سال سے اسلام کو کسی نہ کسی طرح استعمال کیا جاتا رہا ہے تاکہ

Scanned with CamScanner

عوام کو ان کے بنیادی مسائل سے دور رکھا جائے۔ مگر تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جب بھی مذہب کو ریاست پر مسلط کرنے کی کوشش کی گئی مذہب اپنا تبرک کھو دیتا ہے کیونکہ ریاست جبر کے لئے وجود میں آتی ہے کہ وہ ناقابلِ حل تضادات کو معتدل بنائے جیسا کہ لینن کا آفاقی نظریہ ہے، کہ جب ریاست کا جبر مذہب کے نام پر ہوتا ہے تو عوام کی ساری جدوجہد مذہب کے خلاف ہو جاتی ہے جیسا کہ یورپ میں ''چرچ'' کے ساتھ ہوا۔ اسی لئے اگر ملک کی موجودہ سیاسی قوتیں عوام کو اس بحران سے نکالنا چاہتی ہیں تو سب سے پہلے انہیں اپنی سیاست کو ہر قسم کے تعصب سے پاک کر کے عوام کے حقیقی بنیادی مسائل تک محدود کرنا ہو گا۔ عوام کے بنیادی مسائل کیا ہیں؟ اسکی میں پہلے ہی وضاحت کر چکا ہوں کہ پاکستان کے چاروں صوبوں کی قومیتوں کو ان کے مکمل حقوق ملیں اور غریب محنت کش عوام کی اقتدار میں شرکت!

سوال: بعض حلقوں کا خیال ہے کہ بلوچستان میں ''مسلح جدوجہد'' سرداری نظام کے تحفظ کے لئے بھی اس میں کس حد تک صداقت ہے؟

جواب: بلوچستان میں نہ تو کوئی قبائلی جنگ ہے اور نہ ہی یہ کوئی سرداری نظام کے تحفظ کے لئے لڑائی ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ تیسری بار مکمل طور پر بلوچوں کی نسل کشی کرنے کی کوشش کی گئی۔ ہم پر ''ہماری'' ہی افواج نے اس طرح فوجی کارروائی کی جیسے وہ فاتح ہوں اور ہم کسی دشمن علاقے کے لوگ، بلوچستان کے عوام سیاسی طور پر باشعور تھے اور اتنی طاقت بھی رکھتے تھے کہ وہ اپنی آنے والی نسلوں کے تحفظ کیلئے طاقت کا جواب طاقت کی زبان میں دے سکیں اس لئے ہم پر یہ سب مظالم ڈھائے گئے۔ آپ کہتے ہیں کہ بلوچستان کے عوام اپنے سرداروں کے لئے لڑ رہے تھے غور کیجئے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ دنیاوی آسائشوں سے محروم ایک شخص اپنے ''نواب اور سردار'' کی حاکمیت کو قائم رکھنے کے لئے اپنی جان دے دے گا۔ آج کے دور میں یہ کس طرح ممکن ہے؟ حقوق کی جنگ میں اپنی جانوں کا نذرانہ وہی دیتے ہیں جن کا ''کمٹمنٹ'' مضبوط ہو، بلوچستان کے عوام کی جدوجہد سرداروں کے تحفظ کے لئے نہیں اپنے سیاسی و معاشی حقوق اور اپنی نسل اور قوم کی بقاء کے لئے ہے۔

سوال: مستقبل کا لائحہ عمل کیا ہو گا؟

جواب: ابھی ہم کسی پارٹی میں شامل نہیں ہو رہے اور نہ ہی ہم اس مرحلے پر کوئی نئی پارٹی بنا رہے

Scanned with CamScanner

ہیں۔ پانچ سال بعد ہم باہر آئے ہیں اور کیونکہ ابھی حالات سے پورے طور پر باخبر نہیں ہوئے ہیں اسلئے مستقبل کے بارے میں فی الحال کسی فیصلے پر پہنچنا جلد ممکن نہیں، مگر ہم جس جدوجہد کے لئے ماضی میں جیل جاتے رہے ہیں اور جدوجہد کرتے رہے اس میں کمی نہیں آئے گی بلکہ اس مقصد اور جذبے کے لئے جدوجہد میں اور زیادہ تیزی آئے گی۔

(ہفت روزہ معیار کراچی، ۲۸ جنوری تا ۴ فروری ۱۹۷۸ء)

جنرل شیر ولف کی سندھ کے قومی کارکنوں حبیب اللہ نار یجو مرحوم اور قمر بھٹی کے ساتھ ایک یادگار تصویر

سندھ بلوچستان ایک دوسرے کے فطری اتحادی ہیں

انٹرویو:۔ **ضمیر حسین**

سوال:۔ کیس میں دی گئی عام معافی کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب:۔ جیل ہماری جاگیر نہیں ہے کہ ساری عمر یہیں رہیں، معلوم نہیں کہ وہ کیا طریقہ کار اختیار کریں گے۔ ہم نے معافی نہیں مانگی اور نہ ہی ہم چاہتے ہیں۔ ہم ضمانت پر بھی رہا نہیں ہونگے۔ رہا ہونے کے بعد اپنا نظریاتی اور سیاسی کام جاری رکھیں گے۔

سوال:۔ سازش کیس میں عام معافی کی وجہ سے بلوچستان کی صورتحال میں تبدیلی آئے گی؟

جواب؛ جب تک "ریاستی جبر و تشدد" ختم نہیں ہوگا تب تک کسی بھی فرد کے آنے اور جانے سے یا چہروں کی تبدیلی سے اور ہمارے جیل میں رہنے یا باہر نکلنے سے صورتحال میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوگی۔

سوال:۔ آپ موجودہ بحران پر روشنی ڈالیں؟

جواب ہمیں موجودہ بحران کو سمجھنے کیلئے برصغیر کے بٹوارے کی وجوہات کا سائنسی تجزیہ کرنا ہوگا۔ دو عالمی جنگوں نے انگریز سامراج کو نحیف اور کھوکھلا کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ انہیں جلد یا بدیر بوریہ بستر لپیٹنا ہوگا۔ چنانچہ انہیں اپنے مفادات کے تحفظ کیلئے کسی نمک حلال دلال کی ضرورت تھی۔ جبکہ "قومی بورجوا" نے اپنے نمائندے گاندھی جی کی معرفت **Quit India** تحریک شروع کی تاکہ ملک کی وسیع اور بڑی منڈی پر بغیر کسی شراکت کے قابض ہو سکے۔ اس صورتحال نے انگریزوں کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ یہ جاگیردار طبقہ کو فروغ دیکر ملک کی تقسیم کے ذریعہ اپنے مفادات کا تحفظ کرے، تاریخ میں جب کبھی جاگیرداری کو خطرہ درپیش ہوا تو انہوں نے مذہب کو قبروں سے کھود کر بطور آلہ کار استعمال کیا ہے۔ ایسی مثال ہمیں یورپ میں صنعتی دور کے شروع میں ملتی ہے، جہاں جاگیرداری کی بقاء کیلئے "پوپ اور چرچ" کو استعمال کیا۔ بالکل اسی طرح "**پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ**" کا نعرہ لگا کر دراصل جاگیرداری کو بچانے کیلئے یہ ملک بنایا گیا۔ دوسری قوموں کے مقابلہ میں سندھ نے پاکستان کیلئے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کیونکہ وہاں جاگیرداری اپنی بدترین شکل میں موجود تھی اور سندھ میں "**مسلمان جاگیردار**" اور "**ہندو سرمایہ دار**" کے تضادات اتنے شدید تھے کہ "**جاگیردار**" فریق نے سندھ اسمبلی میں پاکستان کیلئے قرارداد پاس کی۔ دراصل "**مسلمان جاگیردار**" کو "ہندو بورجوا" سے مذہبی طور پر کوئی نفرت نہیں تھی بلکہ ہندو سرمایہ دار کا پورے سندھ پر

Scanned with CamScanner

اقتصادی، معاشی اور تجارتی کاروبار پر کنٹرول حاصل تھا اور وہ اس حد تک مضبوط ہوگیا کہ اس کے پاس بڑی بڑی جاگیریں گروی تھیں۔ وہ جاگیریں جاگیردار کو پاکستان بننے کے بعد واپس ملنے کی امید تھی اور ہندو سرمایہ دار کے نکل جانے سے ان کے **"اقتصادی اور طبقاتی مفادات"** ان کے خیال میں محفوظ ہونے کا امکان تھا۔

جناح، جو دراصل چھوٹے کاروباری طبقے سے تعلق رکھتا تھا اس نے ان طبقاتی تضادات کے خلاف جاگیرداری کی بقاء کیلئے، جاگیرداروں کے نمائندے کے طور پر ملک کے بٹوارے کیلئے مذہب کو بطور آلہ کار استعمال کیا۔ چھوٹے اور ابھرتے ہوئے مسلمان سرمایہ دار کے بٹوارے سے صرف اتنی دلچسپی تھی کہ انہیں پاکستان کی صورت میں **"مسلم کمرشل بینک"** ملنے کا آسرا تھا۔ یہ ملک حقیقی تضادات کے **Resolve** ہونے کی صورت میں فطری طور پر وجود میں نہیں آیا تھا بلکہ مصنوعی طور پر بنا تھا۔ **"ہندو بورجوا"** کے جانے کے بعد ان کی جگہ **"مہاجر پناہ گیر بورجوا"** نے لے لی۔

آٹھ دس برس اُس **"پناہ گیر بورجوا"** کو گرفت مضبوط کرنے میں لگ گئے۔ نئی صورتحال ہونے کی وجہ سے انہیں کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ مضبوط اور طاقتور ہوتے چلے گئے اور یہاں کے مسلمان جاگیردار کو جب یہ محسوس ہوا کہ **"ہندو سرمایہ دار"** کے جانے کے بعد بھی ان کے مفادات خطرے میں ہیں تو انہوں نے ایک مرتبہ پھر اپنی بقاء کی خاطر **"قوم پرستی"** کی آڑ میں اُدھم مچانا شروع کیا۔

لیاقت علی نے اپنے **"پناہ گیر بورجوا"** کو مستحکم کرنا شروع کیا تو پنجابیوں نے بطور **"طاقتور فریق"** کے اس سے اپنا حصہ مانگا۔ چنانچہ اس نے ان کو یہ کہہ کر بلیک میل کیا کہ میں الیکشن کرواؤنگا۔ الیکشن ہونے کی وجہ سے بنگال کے **"پیٹی بورجوا"** کے آگے بڑھ کر **"اقتدار"** پر قبضہ کرنے کے امکانات روشن ہوگئے۔ چنانچہ جب پنجابی جاگیردار طبقہ کو اپنے مفادات اور لوٹ کھسوٹ کو خطرہ لاحق ہوا تو انہوں نے قائد ملت کو شہید ملت میں تبدیل کر کے اس مصیبت سے جان چھڑالی۔ اور ریاست کے تمام اداروں پر قابض ہوگئے۔ اسی طرح ون یونٹ اور پیریٹی وغیرہ جیسے قوانین وضع کرتے اور لوٹ مار کرتے ہوئے دیگر قومیتوں کا استحصال جاری رکھا۔ **"پنجابی جاگیردار"** نے **"استعمار محافظ قوت"** کے بل پر اس ملک کا تمام انتظام اپنے ہاتھوں میں رکھا۔ آگے چل کر وہ ''محافظ قوت'' جاگیردار اور سرمایہ دار سے زیادہ طاقتور بن گئی اور اس ملک کی انتظامیہ میں بالواسطہ یا بلاواسطہ حصہ لینا شروع کیا۔ انہوں نے ایوب کے ذریعہ ریاست کی مشینری پر قبضہ کیا اور اس کو سامنے لاکر اپنے مفادات حاصل کئے۔ ہر ترقی پسند تحریک کو کچلا گیا۔ عوام کی آواز کو طاقت کے بل پر دبایا گیا۔ لیکن اس کا ایک عرصہ ہوتا ہے جس کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ یہ تشدد جب بام عروج کو پہنچا تو اس کے پاؤں اکھڑنے لگے۔ بھٹو جو اس تمام عرصے میں ان کیساتھ تھا وہ جب ان

سے الگ ہوا تو عوام پچھلی تمام باتوں کو بھول کر اس کے ساتھ ہوگئی۔ اور ایوب کے بت کو گرانے کا عمل شروع کیا۔ ایوب کے بعد یحیٰ اس طاقت کے بلاواسطہ نمائندے بن کر آئے۔

اس نے 1970ء میں الیکشن کرائے جس میں مشرقی بنگال میں "پیٹی بورجوا" اور یہاں "جاگیردار طبقہ" منتخب ہو کر آیا۔ اگر اس الیکشن کے نتائج کو تسلیم کیا جاتا اور اقتدار "پیٹی بور جوازی" کے نمائندے مجیب کو دیا جاتا تو نہ صرف "جاگیرداری نظام" کو خطرہ تھا جس کی اس ملک پر اجارہ داری قائم تھی بلکہ سامراجی مفادات کو بھی خطرہ تھا چنانچہ جاگیرداری اور ریاست کی محافظ قوتوں نے اپنی اجارہ داری کو بچانے کیلئے اور پنجابی جاگیردار کی طرف سے "چھوٹی قومیتوں" کی لوٹ کھسوٹ کو جاری رکھنے کیلئے بنگال کے تیس لاکھ لوگوں کو قتل کیا گیا۔ لاکھوں عورتوں کی عصمت دری کی گئی۔

بنگال کی تمام معیشت تباہ کی گئی۔ اور یہ سب کچھ ملک کی سلامتی اور اسلام کے نام پر کیا گیا۔ بنگال کی علیحدگی کے بعد ریاست کے جبر وتشدد کے نظام کو اور زیادہ طاقتور بنایا گیا اور نئے چہرے میدان میں لائے گئے۔ بھٹو کو سندھی ظاہر کر کے آگے لایا گیا۔ ہم نے ملک کے ٹوٹنے کے بعد محسوس کیا کہ ایسا نہ ہو کہ ہمارا وجود خطرے میں پڑ جائے چنانچہ ہم نے اپنی تحریک کو تیز کرتے ہوئے "قومی تضادات" کو ابھار کر تصادم پیدا کیا اور اس بحران میں تسلسل پیدا کیا۔ گزشتہ برسوں کی مسلسل جدوجہد کے بعد یہ تحریک ملک کے باقی حصے پر بھی اثر انداز ہوئی اور موجودہ بحران سامنے آیا۔ ہم مارکسزم کی اساسی تعلیمات کے مطابق پیشن گوئی کر سکتے ہیں کہ اس ملک میں جہاں "قومی تضادات" کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ کسانوں اور مزدوروں پر ظلم اور تشدد جاری رکھا جاتا ہے اور معاشی الجھنیں پیدا کی جاتی ہیں یہاں ایسے بحران مخصوص عرصہ کے بعد بار بار آئیں گے۔ جب تک یہ بنیادی تضادات حل نہیں ہونگے۔ اس عرصہ کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ جس طرح ایوب خان اس مخصوص وقت سے زیادہ نہ ٹھہر نہ سکے۔ لیکن بھٹو کی صورت میں یہ مدت کم ہو کر پانچ سال ہوئی۔ بلوچوں پر گذشتہ سالوں میں ظلم ایک مخصوص استعماری قوت نے کیا، لیکن ظاہر یہ کیا گیا کہ یہ بھٹو نے کیا ہے۔ اور تمام مسائل ان کی وجہ سے ہیں۔ اب وقت قریب ہے کہ بھٹو کے نعم البدل کے طور پر پٹھانوں کو آگے لا کر سندھیوں پر یلغار کی جائے گی۔ اور ان کے ساتھ بھی بلوچوں جیسی صورتحال ہوگی۔ کہا جاتا ہے کہ بھٹو کو کوٹ لکھپت جیل میں بھیجا گیا ہے۔ پھر ظلم، زبردستی، دہشت، دباؤ، مہنگائی اور بیروزگاری کو کوٹ لکھپت جیل میں کیوں نہیں بھیجا جاتا؟ دراصل بات افراد کی نہیں بلکہ ریاستی اداروں کے ظلم اور جبر کی ہوتی ہے۔ اس جبر اور ظلم کو ختم کرنے سے ہی یہ سلسلہ ختم ہوگا۔

اب جب "جاگیردار طبقہ" اور اُس "استعماری قوت" کے مفادات کو خطرہ لاحق ہوا تو انہوں نے آج پھر مذہب کو قبروں سے کھود کر عوام کو اصل مسائل سے ہٹا کر انہیں حقیقی دشمنوں سے لڑانے کے بجائے "نظام مصطفیٰ" کے نعروں میں گمراہ کیا جا رہا ہے۔ اس ملک کی ہر چیز آوارہ گرد نظر

Scanned with CamScanner

آئے گی۔ یہاں پر آپ کو اسلام پسند آوارہ گرد ملے گا، مارکسسٹ آوارہ گرد ملے گا، سیاستدان آوارہ گرد ملے گا، مزدور آوارہ گرد ملے گا، سرمایہ دار آوارہ گرد ملے گا، انقلابی آوارہ گرد ملے گا اور آپ کو اس ملک میں رنڈی بھی آوارہ گرد نظر آئے گی۔ جس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔

موجودہ بحران "آئینی بحران" نہیں ہے، کیونکہ پاکستان میں نہ کبھی "آئین" رہا ہے اور نہ ہے۔ اس ملک میں ہمیشہ فردِ واحد کی زبان ہی آئین کا درجہ رکھتی ہے۔ بڑی بھاگ دوڑ کے بعد آئین بنایا گیا، سب سے دستخط لئے گئے لیکن اس کے فوراً بعد دستخط کرنے والوں کو گرفتار کیا گیا اور بنیادی حقوق معطل کئے گئے۔ "آئینی بحران" کا شور مچانے والے سامراج، چھوٹے سامراج اور استحصالی طبقوں کے نمائندے ہیں۔ وہ آئین کا جھانسہ دے کر اپنے اور سامراج کے مفادات کا تحفظ کرنا چاہتے ہیں۔

میرے خیال میں موجودہ بحران معاشی، سماجی اور سیاسی ہے۔ اور جب یہ تینوں بحران ایک ساتھ جنم لیتے ہیں تو انقلابی بحران بن جاتے ہیں۔ یہ تاریخ کا رجحان ہی نہیں بلکہ فیصلہ ہے کہ "قومیں خودمختیاری چاہتی ہیں اور عوام انقلاب چاہتے ہیں"۔

سوال:۔ جیسا کہ آپ عالمی طور پر ایک بلوچ قوم پرست کی حیثیت سے معروف ہیں تو آپ بتائیں کہ قوم پرستی سے آپ کی مراد کیا ہے اور قوم پرستی کے نظریاتی اور سیاسی بنیاد کیا ہونی چاہیئے؟

جواب:۔ ہمیں پہلے واضح کرنا ہوگا کہ قوم پرستی کونسی اور کس لئے؟ آپ اتنی بڑی اکثریت کو بھول کر چند سرداروں کی قوم پرستی چاہتے ہیں۔ یا ان پسے ہوئے طبقات کی قوم پرستی چاہتے ہیں؟ معاف کیجیئے! مجھے آپ کے نعرہ "جئے سندھ" سے اختلاف ہے۔ میں نے اس کا اظہار سید کے ساتھ کراچی میں جناح ہسپتال میں بھی کیا تھا۔ یا با سندھ کی سرزمین یہیں رہے گی۔ سندھ کوئی قمیض نہیں ہے کہ جس کو کوئی پہن کر چلا جائے۔ لیکن سندھی قوم نہیں رہے گی۔ آپ قوم کے اتنے بڑے محنت کش طبقے کو کیوں بھول جاتے ہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ چھ لڑکے چار دانشور اور دو وکیل سندھ میں انقلاب لائیں گے؟ انقلاب اس وقت آئے گا جب دریائے سندھ خون سے سرخ ہو جائے گا۔ ہم سے پوچھو انقلاب کیا ہوتا ہے جس کی ہم نے صرف ایک جھلک دیکھی ہے۔ انقلاب اور آزادی خون اور آگ کا کھیل ہے۔ جب تک آپ عوام کو اپنے ساتھ لے کر نہیں چلیں گے۔ تب تک کچھ بھی نہیں ہوگا۔ آپ عوام کے پاس استاد بن کر جاتے ہیں۔ لیکن آپکو عوام سے سیکھنا چاہیے، کیونکہ عوام ہی انقلاب کا بہترین استاد ہے۔ کیا یہ لڑکے انقلاب لائیں گے، جو ہوٹلوں پر بیٹھ کر ٹیبل پر مکے لگا کر انقلاب کی باتیں کرتے ہیں جس سے ٹیبل تو درکنار ٹیبل پر پڑا ہوا کافی کا کپ بھی نہیں ٹوٹے گا۔

Scanned with CamScanner

سندھ میں قوم پرستی الجھی ہوئی (Vague) ہے، اسکا کوئی سر پاؤں نہیں ہے۔ کم از کم میں یہی سمجھتا ہوں۔ یہاں کی قوم پرستی جاگیردار اور بیوروکریٹ کی قوم پرستی ہے۔ یہ چند نوجوان قوم پرستی کے نعرے دراصل نوکریوں کیلئے لگاتے ہیں چنانچہ انہیں جب نوکری مل جاتی ہے وہ **"نوکرشاہی گروہ"** میں شامل ہو جاتے ہیں۔ **"نوکرشاہی"** کی کوئی قومیت اور طبقہ نہیں ہوتا۔ ان کا دین ایمان اور خدا پہلی تاریخ (تنخواہ کا دن) ہوتا ہے۔ سندھ پر اپنا سر قربان کرنے والا اپنی تمام شاعری دریائے سندھ میں پھینک کر سندھ یونیورسٹی کی وائس چانسلری لے کر بیٹھ گیا۔ سندھ کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہ صدیوں سے رہی ہے اور رہے گی خطرہ سندھی عوام اور سندھی محنت کش کو ہے۔ ان کی بات کریں۔

قومی جدوجہد دراصل طبقاتی جدوجہد کا حصہ ہے۔ **"محکوم قومیں"** خود ایک کلاس ہیں اور طبقاتی جدوجہد ان کی جدوجہد میں شامل ہے۔ یہاں صنعتی پرولتاریہ ایک فیصد ہے وہ انقلاب نہیں لاسکتا۔ جو صرف طبقاتی جدوجہد کی بات کرتے ہیں وہ ٹریڈ یونینسٹ ہیں وہ دراصل سامراج اور سرمایہ دار کے دلال ہیں جو عوام کو ان کے اصل دشمن سے ہٹا کر صرف چند رپوں کی حاصلات تک محدود رکھنا چاہتے ہیں اور قومی تضاد سے منہ موڑ کر سرمایہ دار کے مفادات کا تحفظ کرنا چاہتے ہیں وہ درحقیقت عوام دشمن ہیں۔ جو صرف قوم پرستی کی باتیں کرتے ہین وہ جاگیرداروں کے ایجنٹ ہیں اور ان کے مفادات کا تحفظ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ دور کی کہانی سنا کر عوام کی نظریں ان کے اصل دشمن (سرمایہ دار) سے ہٹانا چاہتے ہیں۔ میں نے یہ بات الفتح والوں کو (انٹرویو دیتے ہوئے) کہی تھی لیکن انہوں نے پوری نہیں لکھی۔ ایسی **"قومی جدوجہد"** جو طبقاتی جدوجہد سے خالی ہو وہ فاشزم ہے۔ عوام کا استحصال دراصل سرمایہ دار اور جاگیردار کرتا ہے۔ مہاجر مزدور سندھی عوام کا استحصال نہیں کرتا۔ جاگیردار عوام کو سرمایہ دار سے لڑا کر دہرا فائدہ حاصل کرتا ہے۔ ایک طرف وہ عوام کو اپنی طرف سے کی گئی لوٹ کھسوٹ سے اندھیرے میں رکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور دوسری طرف اپنے طبقاتی دشمن (سرمایہ دار) کو بھی کمزور کرتا ہے۔

یہ **"عوام دشمنی"** ہے۔ میں نے کوئٹہ میں اردو میں تقریر کی تھی۔ تو وہاں اقبال ترین نے مجھ سے کہا کہ آپ نے غلط کیا۔ میں نے کہا کہ زبانوں کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں۔ جب وہ ہم پر حملہ کریں گے تو ان کو منہ توڑ جواب دیں گے۔ آج وہی اقبال ترین • جئے سندھ تحریک کا بانی رہنما) بہادر شاہ ظفر کا کردار بن کر اردو ڈراموں میں کام کرتا ہے۔

جب بلوچستان میں اردو کو سرکاری زبان قرار دیا گیا تو میں نے **NAP** سے اختلاف کیا اور میں نے کہا کہ اردو پہلے ہی سرکاری زبان تھی اس کے اعلان کی کیا ضرورت تھی۔ وہ بھٹو اور بزنجو کی سندھ کے خلاف سازش تھی۔ میں نے کہا کہ صرف سندھی زبان وہ زبان ہے جو سرکاری زبان بن سکتی ہے اور اس علاقے میں یہی صحیح بات ہے۔ آپ نے اُسے نقصان پہنچانے کیلئے یہ کام کیا ہے۔

Scanned with CamScanner

سندھ میں ان ہی دنوں لسانی فسادات ہوئے تھے۔ میں نے سندھیوں کی ہر طرح بھرپور مدد کی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ سید اسکو سنبھال نہ سکے اور یہ بوجھ بھی ہمیں ہی برداشت کرنا پڑا۔ مجھے NAP والوں نے بلوا کر پوچھا کہ تم نے سندھیوں کی مدد کی ہے؟ میں نے کہا "ہاں" کیونکہ سندھ متاثر ہوتا ہے تو ہم متاثر ہوتے ہیں۔ اگر بلوچ متاثر ہوتے ہیں تو سندھی متاثر ہوتے ہیں۔

مجھ پر ٹربیونل میں الزام لگایا گیا کہ میں نے قومیتوں کی بات کی ہے۔ میں نے کہا ہاں کیونکہ میں بلوچ ہوں مجھے بلوچ ہونے پر فخر ہے۔ اگر میں بلوچ ہوتا تو کیا ہوتا۔ ججوں نے پوچھا کہ کیا ہوتے؟ تو میں نے کہا کہ اگر میں بلوچ نہ ہوتا تو حرامی ہوتا۔ کیونکہ جو اپنے قوم سے نہیں پہچانا جاتا وہ حرامی ہے۔ کورٹ کے اختتام کے بعد ولی خان نے مجھ سے کہا کہ تمہیں قومیتوں کے متعلق ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ میں نے کہا کہ قومیتوں کی بات تو آپ کے منشور میں شامل تھی۔ انہوں نے کہا کہ تمہیں یہ تشریح (Interpretation) نہیں کرنی چاہیے تھی۔ تم سب کو پھانسی چڑھاؤ گے۔ میں نے کہا کہ آپ مجھے حرامی کرنا چاہتے ہیں؟ میں گولیوں کے منہ میں اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں ڈرا، یہ بات پھانسی کے تختے پر بھی کہوں گا کہ میں بلوچ ہوں۔ مجھے بلوچ قوم اور تاریخ پر فخر ہے۔

سوال:۔ آپ بلوچستان کی تحریک کے متعلق کچھ بتائیں گے؟

جواب بلوچوں کی جدوجہد دنیا کے تمام مظلوم انسانوں کی جدوجہد ہے۔ یہ اس ملک کے مظلوم قوموں کی جدوجہد ہے۔ یہ جدوجہد سندھیوں، پٹھانوں اور بلوچوں کی جدوجہد ہے۔ یہ جدوجہد بین الاقوامی سامراج اور اس کے دلالوں کے خلاف ہے۔

سوال:۔ عام طور پر کہا جاتا کہ بلوچستان میں تحریک NAP چلا رہی تھی کیا یہ صحیح ہے؟

جواب غلط بالکل غلط ہمیں بھی یہی کہا گیا تھا چنانچہ اس پر میں نے کہا کہ NAP ملوث نہیں ہے لیکن بلوچ نوجوان ملوث ہیں۔ اور یہ پروپیگنڈہ سامراج کی طرف سے ایک سوچی سمجھی منصوبہ بندی کے تحت چلائی گئی تھی تاکہ بلوچوں کی جدوجہد کو سرداری نظام کو بچانے کی جدوجہد ثابت کر کے اُسکے امیج کو خراب کیا جائے لیکن ایسی سامراجی چالیں ناکام ہوگئیں۔ آج تمام دنیا کے ترقی پسند اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ یہ کوئی قبائلی لڑائی نہیں ہے بلکہ یہ مظلوم انسانوں کی نجات کی جنگ ہے۔ ٹھیک ہے بلوچستان میں قبائلی نظام موجود ہے لیکن کبھی کبھی ایسے تاریخی طوفان اٹھتے ہیں کہ طبقے اپنے Natural Process سے گزرے بغیر آخری درجے پر پہنچ جاتے ہیں اور وہی کچھ بلوچستان میں بھی ہوا ہے۔ وہاں تحریک کے تمام رُخ ترقی پسند ہیں اور وہاں کی قیادت سائنسی فکر کے ساتھ مسلح ہے۔ بلوچستان میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ فطری ہے۔ ایسے ملک میں جہاں بنیادی تضاد قومیتوں کا ہو اور انہیں حل کئے بغیر پیچھے دھکیلا جائے تو وہاں ایسے نتائج برآمد ہونا فطری امر ہے۔

بلوچوں کی ماؤں اور بہنوں کی زبردستی عصمت دری کی گئی، معصوم بچوں کو سنگینوں سے مارا گیا انہیں کوئی نہیں بھول سکتا۔ ہمارے ہزاروں لوگوں کو مارا گیا، ہزاروں غائب ہیں، صرف مری قبیلہ کے ایک ہزار سے زائد لوگوں کو میں نام سے جانتا ہوں شہید ہو چکے ہیں۔ ہماری جڑیں اس دھرتی کی گہرائی میں ہیں جیسے کسی درخت کو جس کی جڑیں دھرتی میں ہوں اسے کوئی طوفان اکھوڑ نہیں سکتا۔ نہ اس کی شاخیں ٹوٹ سکتی ہیں۔

جس درخت کی جڑیں دھرتی میں نہ ہوں اسے طوفان اکھاڑ دے گا۔ ہم یہاں کے کسی بھی آپے خان کو ایک سال کے اندر جھکا سکتے تھے لیکن اس تمام لڑائی میں ہماری جنگ بین الاقوامی سامراج کے ساتھ تھی جو بلاواسطہ ملوث تھا۔ ہمیں پانچ سالوں کے بعد بھی جھکا نہیں سکے ہیں۔ یہ کوئی سرداری نظام کو بچانے کی جنگ ہوتی تو کب کی ختم ہو جاتی۔ لیکن میں نے کہا کہ "پروپیگنڈہ سے ایجیٹیشن تک" ہم نے بیس برس فضول جھک ماری لیکن حاصل مطلب صفر نکلا۔ پھر ہم نے اپنے ملک کے مخصوص حالات کے مطابق اس اصول کو "ایجیٹیشن سے پروپیگنڈہ تک" میں تبدیل کیا تو نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ ہمارا عمل ہماری پروپیگنڈہ بن گیا ہے۔ کوئی اسلحہ اگر مارکسی فکر کے تابع نہیں ہے تو پھر ڈاکوؤں کے ہاتھ میں ہے۔ انقلابی جدوجہد کیلئے مارکسی نظریہ بنیادی اسلحہ ہے۔ سائنسی فکر کو سمجھنے کیلئے میں روزانہ آٹھ گھنٹے مطالعہ کرتا ہوں۔ میں افسانوں اور شاعری وغیرہ کی ایک سطر بھی پڑھ نہیں سکتا۔ ایسی فضولیات کی چار سطریں پڑھنے سے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔ جتنا بھی ٹھوس اور فلسفیانہ مواد ہو میں اسے چوبیس گھنٹے بلا کسی تھکاوٹ کے پڑھ سکتا ہوں۔ ہماری تحریک میں شامل ہر بلوچ نوجوان پر یہ لازم ہے کہ وہ روزانہ ایک گھنٹہ مارکسی تعلیم حاصل کریں اور ہر کارکن کے سینے پر لینن کا بیج آویزاں ہونا لازمی ہے۔

میں نے ایوبی آمریت کے خلاف گوریلا لڑائی لڑتے ہوئے ایک دفعہ گوریلوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ آپ انہیں (حکمران گروہ کو) شکست ضرور دے سکیں گے لیکن ایک شرط پر وہ یہ کہ دھرتی اور بندوق کو اپنا ایمان سمجھیں کیونکہ وہ (حکمران) لڑتے ہیں پہلی تاریخ کی تنخواہ کیلئے اور ہم لڑتے ہیں تاریخ میں اپنا کردار ادا کرنے کیلئے۔ پھر بھی اگر شکست ہو تو مجھے پھانسی پر چڑھا دیں۔ میں کہتا ہوں کہ مارکسی تعلیم کو دنیا میں صرف تین لوگوں نے سمجھ کر مختلف حالات میں صحیح طور پر اس پر عمل کیا ہے وہ ہیں لینن، ماوزیتنگ اور چی گویرا جس نے سامراج کے پہلو میں بیٹھ کر کیوبا میں انقلاب لایا اور ہم ہزار میل دور بیٹھ کر ابھی جدوجہد کی منزل پر ہیں۔ ہر جگہ وہاں کے حالات کو مدنظر رکھ کر انقلاب لایا جا سکتا ہے۔ ہر صورت ہر جگہ نہیں ہو سکتی۔

Scanned with CamScanner

سوال:۔ سندھ اور بلوچستان کے عوام کا اتحاد کس طرح ہوسکتا ہے؟

جواب میری یہ پختہ رائے ہے، چاہے تاریخ اسے غلط ثابت کرے کہ جب تک سندھی بیدار نہیں ہونگے تب تک بلوچ منزل پر نہیں پہنچ سکیں گے، اور اسی طرح جب تک بلوچ ساتھ نہیں دیں گے تب تک سندھی کامیاب نہ ہوسکیں گے۔ کیونکہ سندھ میں کچھ بھی ہو بلوچ اس سے لامحالہ ضرور متاثر ہوگا۔ اور اگر بلوچستان کو کچھ ہوا تو سندھ ضرور متاثر ہوگا۔ یہ اتحاد فطری عمل کے ذریعہ اپنی راہ خود ہی بنائیگا۔ درحقیقت عمل ہی تنظیم کو بناتا ہے نہ کہ ان کے برعکس جیسے ہمارے دانشور دوست جو اپنے منہ میاں مٹھو کے مصداق بڑے مارکسسٹ ہیں، لیکن انہیں اپنے ملک کے چھوٹے شہر ٹنڈو آدم کا بھی پتہ نہیں ہے۔ اور نہ دیہات کی خبر ہے۔ آپ عوام کے پاس جائیں اور ان سے سیکھیں، کیونکہ عوام ہی بہترین استاد ہے۔

سوال:۔ آپ کا قومی اتحاد کے متعلق کیا خیال ہے؟

جواب:۔ میرے پاس کراچی جناح ہسپتال میں بڑی داڑھیوں اور سوٹ بوٹ والے آئے اور ایسا ہی سوال مجھ سے پوچھا۔ میں نے انہیں کہا کہ یہ اتحاد کس کے خلاف ہے؟ کیا سامراج کے خلاف یا سرمایہ دار یا جاگیردار کے خلاف؟ کیا یہ اتحاد مزدوروں، کسانوں اور قومیتوں کیلئے ہے؟ اگر جواب نفی میں ہے تو یقیناً یہ اتحاد مظلوم عوام کے خلاف ہے، کیونکہ اصل مقصد چہروں کی تبدیلی نہیں بلکہ نظام کی تبدیلی ہے۔ میں نے انہیں کہا کہ آپ اسلامی نظام لائیں، اس کے بعد پہلا خلیفہ کون ہوگا؟ دوسرا کیسے قبضہ کرے گا۔ تیسرا کیسے اور چوتھا کیسے؟ انہیں باری باری قتل کون کرے گا؟ آپ میرے پاس گیارہ بجے آئے تھے اور اب ساڑھے گیارہ بجے ہیں، آپ یہ آدھا گھنٹہ واپس لوٹا سکتے ہیں؟ آپ یہ آدھا گھنٹہ نہیں لوٹا سکے تو تاریخ کو چودہ سو برس پیچھے کیسے دھکیل سکیں گے؟ یہ سب دھوکہ ہے۔

سوال:۔ NDP کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب:۔ NDP نعپ کا بدروح اور مکروہ رخ ہے۔ اس پارٹی اور دیگر رجعت پسند پارٹیوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ نعپ سیکولرازم، سوشلزم، سامراج دشمنی اور قومیتوں کی بات لفاظی کی حد تک تو کرتی تھی، لیکن یہ جماعت ان تمام اصولوں پر پانی پھیر کر رجعت پسند پارٹیوں سے مسابقہ کے فکر میں ہے۔

سوال:۔ آپ کے نعپ کے ساتھ اختلافات تھے؟

جواب جی ہاں، واضح نظریاتی اختلافات تھے۔ میں کبھی نعپ کارکن نہیں رہا ہوں۔ ملکی سیاست میں تمام پارٹیاں بورجوا اور جاگیرداروں کی نمائندہ پارٹیاں تھیں۔ نعپ باتوں کی حد تک ترقی پسند تھی، چنانچہ دوسری گندگیوں کی بنسبت مجھے یہ گند ہلکا لگا اور اس کے پلیٹ فارم کو بوقت ضرورت استعمال کرتا رہا۔

سوال:۔ آپ کی گرفتاری کیسے عمل میں آئی؟

جواب؛۔ میں اس زمانے میں لندن میں اپنے ایک دوست کے گھر پر سویا ہوا تھا کہ صبح کو سات بجے مجھے جگا کر بتایا گیا کہ کوئی ضروری ٹیلیفون کال ہے۔ سابق سیکریٹری اطلاعات اور ڈان کے اسٹاف رپورٹر نسیم احمد مجھ سے ٹیلیفون پر بات کرنا چاہتے تھے۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ نے آج کا لنڈن ٹائمز اخبار پڑھا ہے۔ میں نے بتایا کہ میں ابھی نیند سے بیدار ہوا ہوں اور یہ لنڈن ہے، یہاں اس وقت کون نالائق اٹھ کر باہر جا کر اخبار پڑھے گا۔ اس کے علاوہ میں اس گھر میں مہمان ہوں اور اسکے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں۔ نسیم احمد نے گھبرائے ہوئے آواز میں کہا کہ اخبار نے لکھا ہے کہ ایرانی بلوچستان میں گوریلوں کے اڈوں پر ایرانی فوج کی طرف سے بمباری کی گئی ہے۔ میں نے کہا کہ میں ایرانی نہیں ہوں بلکہ تمہارے ملک پاکستان کا شہری ہوں۔ اس نے پوچھا کہ کیا میں متاثر ہوتا ہوں؟ درحقیقت وہ پوچھنا چاہتے تھے کہ میرا پروگرام کیا ہے؟ میں نے اُسے بتایا کہ دنیا میں جہاں بھی کوئی ظلم ہوتا ہے، جہاں بھی حق تلفی ہے اور اس ظلم اور حق تلفی کے خلاف جدوجہد ہو رہی ہے، وہ تحریک میری ہے پھر اگر بلوچوں پر بمباری ہو رہی ہے تو میں کیسے خاموش رہوں گا۔

دوسرے دن مجھے ایک دوست نے ٹیلیفون پر بتایا کہ لندن کی تمام اخباروں میں خبر چھپی ہے اور بی بی سی سے یہ خبر نشر ہوئی ہے کہ جنرل شیر محمد مری اپنے تمام پروگرام منسوخ کر کے واپس بلوچستان پہنچ گئے ہیں۔ میں نے اس غلط خبر نشر کرنے پر بی بی سی کے نمائندے کو فون کر کے وجہ دریافت کی۔ تو انہوں نے غلطی پر معذرت کر لی۔ اس کے ساتھ ساتھ بھٹو حکومت نے مجھ پر دباؤ ڈالا کہ میں وطن واپس نہ جاؤں اور لندن میں حکومت کے خرچے پر قیام کروں علاوہ ازیں انہوں نے پانچ سو پاؤنڈ ماہانہ دینے کی آفر کی۔ میں نے اسے رد کر دیا اور کہا کہ آج میری دھرتی اور میری قوم نے مجھے پکارا ہے اور میں ضرور وطن واپس لوٹوں گا۔ یہ بات سامراج اور اس کے دلالوں پر گراں گذری اور انہوں نے مجھے گرفتار کروایا۔ میں نے ان گماشتوں کو کہا تھا کہ میں بلوچستان میں آپ لوگوں کا انتظار کروں گا۔ آج بھٹو کوٹ لکھپت جیل میں ہے اور ٹربیونل اڑایا جا چکا ہے۔

سوال:۔ عراقی اسلحہ اسکینڈل کی حقیقت کیا ہے؟

جواب؛۔ اکبر بگٹی چونکہ ہمیشہ اپنے آپ کو بلوچ قوم پرست کے طور پر پیش کرتے رہے تھے اور انہوں نے بھٹو سے گٹھ جوڑ کر کے بلوچوں کی جدوجہد کو ناکام بنانے کیلئے عراق جا کر وہاں کی حکومت کو یقین دلایا کہ بلوچوں کیلئے اسلحہ چاہئے، چنانچہ وہ اسلحہ آیا لیکن مذکورہ واقعہ میں ملوث 40 آدمیوں کو شوٹ کیا گیا۔

سوال:۔ آپ اپنی ذاتی زندگی کے متعلق کچھ بتانا پسند فرمائیں گے اور یہ کہ آپ نے سائنسی سوچ وفکر کس سے متاثر ہو کر اور کہاں سے حاصل کی؟

جواب:۔ درحقیقت میرے والد قوم پرست تھے۔ انگریز سامراج کے خلاف جنگ کرتے ہوئے

شہید ہوگئے۔ ہمیں ان کی قبر کا بھی پتہ نہیں ہے۔1918ع کی مری بغاوت میں میرے تمام خاندان کو کالا پانی (جزیرہ انڈمان) بھیجا گیا تھا۔ واپسی میں دوران سفر میں پیدا ہوا تھا۔ میں بنیادی طور پر جاگیردار طبقہ سے تعلق رکھتا ہوں، لیکن بچپن سے یتیمی اور دکھوں نے مزاج کو حساس بنایا۔ میری تمام ملکیت پر دوسرے لوگ قبضہ کر گئے۔ میں چرواہا رہا ہوں، مزدوری اور محنت کی ہے اور میں ننگے پاؤں اور صرف ایک قمیض میں تین میل کے فاصلے پر پیدل اسکول پڑھنے جاتا تھا۔

مجھے پانچویں جماعت میں فرسٹ پوزیشن لینے کی وجہ سے 12 روپے اسکالرشپ ملی۔ کوئٹہ میں دوران تعلیم مجھے ان 12 روپوں میں اپنی تمام ضروریات کو پورا کرنا پڑتا تھا اور کرایہ نہ ہونے کی وجہ سے چھٹیوں میں گاؤں نہیں جا سکتا تھا۔

میں نے اپنی عملی زندگی کی ابتداء لاہور میں ٹیکسی ڈرائیور کے طور پر کی، بالآخر میں نے اپنی ملکیت واپس لے لی، میں نے اپنی زمین پر خود ہل چلایا، خود محنت کر کے اپنا مکان بنایا، وہاں کے لوگوں سے میل ملاقات اور انکی انتہائی غربت کی زندگی نے مجھے متاثر کیا، مجھے تاریخ یاد نہیں کہ میں کب انقلابی سوچ اور فکر سے روشناس ہوا، لیکن یہی وہ زمانہ تھا جب میرے خیالات میں تبدیلیاں ہوئیں۔

سوال:۔ سندھ کے قوم پرستوں کیلئے آپ کا کوئی پیغام؟

جواب:۔ انکے لئے یہی کہ وہ شاہ لطیف کو پڑھیں۔ ظلم یہ ہے کہ اتنے بڑے شاعر کو ایک روحانی شاعر بنا کر پیش کیا جا رہا ہے، جبکہ انہوں نے عوامی جدوجہد میں یقین کا اظہار کیا ہے۔ واکا کرن مون وس، بدھن کم بروچ جو

(مرے بس میں صرف آواز بلند کرنا ہے، سننا اس کا کام ہے جس کے ہاتھوں میں اقتدار اور طاقت ہے) یہ کیا ہے؟ یہ عوام کی بات ہے کہ وہی سب کچھ کریں گے ہم صرف ان تک اپنی آواز پہنچائیں، وہی بات سچل سرمست نے کی ہے، لیکن ان شعراء کو صرف پیر سمجھا گیا ہے جبکہ سامراجی دلالوں نے قلندر کو بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ جس طرح پنجابیوں نے وارث شاہ کو چھوڑ کر اقبال کو سر پر چڑھایا ہے۔ شاہ لطیف ہوں یا وارث شاہ انہوں نے ترقی پسند باتیں اس وقت کی ہیں کہ جب مارکس ابھی پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ (سندھی قوم پرست) انہیں پڑھیں، سمجھیں اور عوام کو صحیح اور حقیقی رُخ سے متعارف کروائیں۔ عوام سے قریبی رابطہ رکھیں اور ان میں کام کریں کیونکہ ان کی شرکت اور بھرپور تعاون کے بغیر انقلاب ناممکن ہے۔

(وطن دوست پبلیکیشن "بلوچستان نمبر" جنوری 1978ء)

Scanned with CamScanner

عام معافی کا اعلان بلوچوں کے ساتھ بھیانک مذاق ہے

انٹرویو: عاقل لوذھی

لوذھی: 77ء میں بھٹو حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد آپ کو رہائی ملی۔ رہائی کے بعد آپ نے بلوچستان کے حالات میں کیا تبدیلی دیکھی؟ عام معافی کا کہاں تک اثر ہوا؟

مری: میں کوئٹہ سے باہر نہیں گیا ماسوائے اس کے کہ پورے بلوچستان میں فوجیں موجود ہیں۔ بلوچستان کی فضاء ہزاروں افراد کی چیخ و پکار مظلوموں کی آہ اور بارود کی گھٹی گھٹی بد بو سے بوجھل ہے۔ یہاں ہزاروں معصوم بچے یتیم ہو چکے ہیں۔ ہزاروں عورتیں بیواہ ہو چکی ہیں، ہزاروں مرد اپاہج ہو چکے ہیں، ایسی حالت میں عام معافی کا طریقہ بلوچ عوام کے ساتھ مذاق ہے، کیا عام معافی کے معنی یہ ہیں کہ قاتل نے مقتول کو معاف کر دیا۔ عصمت لوٹنے والوں نے عصمت لوٹنے کے بعد بلوچ عورتوں کو معاف کر دیا ہے۔ بھیڑ بکری اور جانوروں کو لوٹنے والوں نے ان کے مالکوں کو معاف کیا۔ معافی کا یہ مفہوم، یہ فکر ہمیشہ فاتح کی ہوتی ہے۔ نہ ہم کسی کو فاتح تسلیم کرتے ہیں نہ ہم کسی کے محکوم ہیں۔ بلوچ عوام نے توپوں کی گولہ باری اور جٹ طیاروں کی بمباری اس لئے برداشت نہیں کی تھی کہ ان کو معافی دی جائے۔ ان لوگوں کو معاف کیا جائے جنہیں لوٹا گیا تھا، ان عورتوں کو معاف کیا جائے، جن کی عصمت لوٹی گئی تھی۔ انسانی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہماری بچیوں کو منڈیوں میں فروخت کیا گیا۔ یہ محض الزام نہیں ہے، یہ غلط نہیں ہے۔ اگر کوئی اس کو غلط سمجھتا ہے تو میں ان بچیوں کو پیش کر سکتا ہوں جن کو میں نے خرید کر آزاد کیا۔ ان واقعات اور ان حالات کے بعد عام معافی کا اعلان بلوچ عوام کے ساتھ مذاق ہے۔ یہ انسانی تاریخ کا مذاق ہے۔ انہوں نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”آپ تلاش کریں یا انسانی تاریخ سے پوچھ کر بتائیں۔“

شیر محمد مری تھوڑی دیر کیلئے خاموش ہو کر خلا میں گھورنے لگے اور پھر اسی لہجے میں کہنے

Scanned with CamScanner

لگے:۔

''ساڑھے تین ہزار سے زائد بلوچ خاندان اس وقت افغانستان میں ہیں اور میں یہ بھی بتاتا جاؤں کہ یہ لوگ صرف مری نہیں ہیں۔ جو لوگ پہاڑوں پر تھے وہ آج بھی وہیں ہیں، کوئی بھی واپس نہیں آیا، علاوہ ان سولہ آدمیوں کے جنہیں خفیہ تصفیے کے تحت ممتاز لیڈر واپس لائے ہیں۔ یہ لوگ ان لیڈروں کے اپنے رشتہ دار ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ عام معافی کے تحت تمام قیدیوں کی رہائی کا اعلان کیا گیا تھا لیکن 5 جولائی 77ء کے اعلان کے تحت پورے ایک سال بعد جولائی 78ء میں شادین مری کو بدنام زمانہ قلی کیمپ سے رہا کیا گیا اور ہمارے پاس متعدد ایسے افراد کی فہرست ہے جنہیں رہا نہیں کیا گیا اور ہمارے بار بار مطالبے کے باوجود ان کی زندگی اور موت کے بارے میں بھی نہیں بتایا جاتا۔ اس کا ایک اور المناک پہلو ہے۔ ہمارے لئے تکلیف دہ مسئلہ ان کی بیویوں کا مسئلہ ہے۔ اگر ان کو گولی ماردی گئی ہے تو ان کے والدین اپنی جوان بیٹیوں کو دوسری جگہ بیاہ دیں، اگر زندہ ہیں تو برسوں کی منتظر بیوہ تادم زیست ان کا انتظار کرتی رہیں گی۔ اسی مسئلے کو لیکر ان بیسوں عورتوں کے بیسوں شوہروں کے بارے میں ہم پر ان عورتوں کے ورثاء انتہائی سخت دباؤ ڈالے ہوئے ہیں۔ اگر یہ لوگ زندہ ہیں تو ان بیٹیوں کو شوہروں کے ورثاء اپنے گھر لے جائیں اگر ان کو گولی ماردی گئی ہے تو ہم اپنی ان جوان بیوہ بیٹیوں کو مزید اپنے پاس رکھنے کی بجائے دوسری جگہ بیاہ دینگے۔ ہم اپنی انتہائی کوشش کے باوجود حکام سے کچھ معلوم نہیں کرسکے۔ ایسی صورت میں ہم ان بیٹیوں کے ورثاء کو کوئی بھی جواب دینے کے قابل نہیں ہیں، کیونکہ تصفیہ ہونے کے باوجود نہ تو ممتاز لیڈر اور نہ ہی حکومت وقت ہمیں اس سلسلے میں معلومات دینے کیلئے آمادہ ہے۔ یہ ہیں بلوچوں کی چادر اور چاردیواری کی باتیں۔ شاید یہ باتیں بلوچستان کے نام نہاد تصفیہ کے مطالبے میں شامل نہیں تھیں۔

لودھی: کیا یہ درست ہے کہ بلوچستان کی تحریک کو کالعدم نیپ یا این ڈی پی چلا رہی ہے؟ کیا آپ حکومت اور بلوچی لیڈروں کے درمیان ہونے والے مذاکرات سے مطمئن نہیں؟

مری: جہاں تک بلوچستان میں تحریک کا تعلق تھا نہ وہ این ڈی پی کی ہے اور نہ نیپ کا اس سے کوئی تعلق ہے۔ تحریک خالص بلوچوں کی تحریک ہے۔ این ڈی پی اور نیپ کے لیڈروں کا یہ پروپیگنڈہ ان کے جاگیردارانہ ذہن کی پیداوار ہے۔ پاکستان کے عوام خصوصاً بلوچ، 77ء کے بلوچ 73 کے بلوچ سے مختلف تھے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ آج 78ء ہے۔ آج 78 کا بلوچ

Scanned with CamScanner

77ء کے بلوچ سے مختلف ہے، اس کی قومی تحریک اپنے ہزاروں بیٹوں کی لاشوں، سینکڑوں بچوں کی یتیمی، ہزاروں بیواؤں کے آنسوؤں کی تاریخ کو ہتھیلیوں پر رکھے ہوئے پکار رہی ہے۔ جو لیڈر اس کو این ڈی پی کی تحریک سمجھتے ہیں کہ وہ ان تمام چیزوں کو بیچ کر ایک بار پھر اپنے لئے کرسی، ذاتی مفادات یا سرداری چاہتے ہیں یا خان اور سردار بننے کی کوشش کر رہے رہیں وہ شاید انسانی تاریخ سے واقف نہیں ہیں۔ یہ بیچارے شاید نہیں جانتے کہ ایسی تحریکوں کو کوئی بھی نہیں بیچ سکتا۔ البتہ ایسی تحریکوں کو سبوتاژ کرنے کیلئے کئی روایاتی سیاسی سردار اور نام نہاد سیاسی لیڈر سازشیں کرتے رہتے ہیں۔ یہ سازشیں آج بھی بلوچ عوام کے خلاف نہایت شد و مد سے کی جا رہی ہیں۔ جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق ہے کہ بلوچستان کے ممتاز لیڈروں نے یا جیسے کہ مختلف اخبارات میں انکو بلوچستان کے ممتاز لیڈر لکھا جاتا ہے، تو سب سے پہلے میں آپ ہی سے پوچھوں گا کہ آپ کے پاس کونسا بیرومیٹر ہے کہ آپ نے انکو بلوچ لیڈر تسلیم کیا ہے اور دوسرا میں ان سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ کو بلوچ عوام نے بات چیت کیلئے نامزد کیا تھا؟ اگر اس کا جواب وہ ہاں میں دیتے ہیں تو ان کے اس کھلے جھوٹ کو میں پریس کے ذریعے چیلنج کرتا ہوں۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو بلوچستان کے ان نام نہاد ممتاز لیڈروں کو یقیناً بلوچ عوام نے 73ء سے 77ء تک کی تمام تفصیلات انہیں بتائی ہونگی، میں ان سے سوال کرتا ہوں کہ بلوچستان میں پانچ سالہ قیامت کے دوران کتنے بلوچ شہید ہوئے؟ اگر آپ ان شہیدوں کی صحیح تعداد کا بیس فیصد ہی بتا دیں یا ان شہداء میں سے صرف دو فیصد کے نام بتائیں یا یہ بتائیں کہ کتنی بہو بیٹیوں کی عصمت دری ہوئی؟ اگر اس کا بھی آپ پانچ فیصد بتائیں یا بتا دیں کہ کتنی ننگی لاشیں درختوں سے لٹکی ہوئی تھیں یا کتنے ملین بھیڑ بکری اونٹ لوٹ لئے گئے ہیں؟ اگر اس کی دس فیصد تعداد بھی یہ لیڈر بتا دیں تو میں انہیں بلوچ لیڈر مان لونگا۔ کتنی معصوم بچیوں کو منڈیوں میں بیچا گیا وہ کسی ایک کا نام بھی نہیں بتا سکتے۔ انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ کتنے لاکھ ایکڑ کھڑی فصلوں کو آگ لگائی گئی۔''

شیر محمد مری بے حد جذباتی ہو گئے تھے۔ ان کی آنکھیں بھیگ سی گئیں تھیں۔ تھوڑی دیر توقف کے بعد وہ بولے ''ان لیڈروں نے اپنی زمینوں اور شنک کے بارے میں مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے مراعات حاصل کر لی ہیں۔ بلوچوں سے ان کا صرف اتنا ہی تعلق ہے۔ اگر یہ کچھ اور بتائیں تو میں کم از کم انہیں ایک فرد کی حیثیت سے ان کو ماننے کیلئے تیار ہوں کہ یہ بلوچوں کی

Scanned with CamScanner

نمائندگی کر رہے ہیں۔ جو شخص صرف اپنے بارے میں جانتا ہو اور بلوچ پر جو بیتی اس کے بارے میں سرے سے کچھ نہ جانتا ہو۔ تو ایسے مارشل لاء کے نامزد ممتاز بلوچ لیڈر اور اخبارات کی سرخیوں کے بلوچ لیڈر بیچارے اس کے سوائے اور کیا کر سکتے ہیں، جیسا کہ انہوں نے کیا۔ یہ لوگ ششک کی بحالی، اپنی زمینوں، اپنے دوستوں کی زمینوں کی بحالی اور اپنے عزیز رشتہ داروں کی چند ملازمتیں حاصل کرنے کو بلوچستان کے مسئلہ کا حل قرار دیتے ہیں اور ملاقات کے بعد بات چیت سے صرف مطمئن ہونے کا اعلان ہی نہیں کرتے، بلکہ خوشی میں سرشار ہو کر جھومنے لگتے ہیں۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ ہے کہ دو ہفتے کے بعد ہی اپنی لیڈری کا پول خود کھولتے ہیں کہ ہم نے کبھی سیاسی بات چیت کی ہی نہیں۔ شاید یہ سچ کہتے ہیں کیونکہ اقتدار کے نامزد نمائندے شاید صرف اپنی ذات کیلئے ہی بات کر سکتے ہیں عوام کیلئے نہیں۔ ان کے خیال میں ذاتی مراعات حاصل کرنا بات چیت میں نہیں آتی۔

آپ کے سوال کا ایک حصہ تھا کہ بات چیت کی تفصیلات کیا ہیں؟ تو سب سے پہلے سبی میں جنرل ضیاء الحق سے تین محترموں کی بات ہوئی۔ بات چیت سے قبل ہم سب کا یہ مشترکہ فیصلہ تھا کہ ضیاء الحق صاحب سے کہا جائے کہ ہم مختار کل نہیں ہیں کہ کوئی تصفیہ کر لیں۔ لہٰذا جنرل صاحب کو یہ جاننا ہوگا کہ آپ ہمیں مختار کل سمجھتے ہیں تو یہ درست نہیں۔ دوسری یہ بات صاف طور پر جنرل سے کہنی ہوگی کہ ہم حکومت کی ایسی ایجنسی کا کام نہیں کریں گے کہ عوام کو دھوکہ دیں۔ البتہ اگر جنرل صاحب چاہیں تو ایک قاصد کی حیثیت سے آپ کا پیغام بلوچ عوام خصوصاً ان قوتوں تک پہنچا دیں گے جو کہ پانچ سال سے برسرپیکار ہیں اور ان کے مطالبات آپ تک پہنچائیں گے۔ میری معلومات کے تحت کم از کم سبی کی ملاقات میں خیر بخش مری نے ان تمام چیزوں کا اظہار کیا اس کے بعد یہ بھی مشترکہ طور پر طے پایا کہ انفرادی طور پر ممتاز لیڈروں میں سے کوئی بھی اپنے طور پر حکومت سے کچھ بھی بات نہیں کرے گا۔ اس کے بعد شہنشاہ ایران کی آمد پر تین حضرات خیر بخش مری، عطاء اللہ مینگل اور غوث بخش بزنجو کو اسلام آباد طلب کیا گیا تو خیر بخش مری اس دربار میں نہیں گئے۔ ہمارے دوسرے دونوں حضرات اسلام آباد گئے۔ کہا یہ گیا تھا کہ بلوچستان کے مسئلہ پر بات چیت ہوگی۔ یہیں سے وہ المیہ شروع ہوتا ہے کہ مشترکہ فیصلے کے باوجود ہمارے مہربانوں نے حکومت سے از خود خفیہ بات چیت شروع کی اور جسے خیر بخش مری اور ہم کچھ دوستوں کے علاوہ بلوچ عوام سے بھی خفیہ رکھا گیا۔

Scanned with CamScanner

اس کے بعد پھر سردار داؤد صدر افغانستان کی آمد پر تینوں کو دعوت دی گئی کہ وہ بریفنگ میں آ کر شامل ہوں۔ اگرچہ بزنجو صاحب پہلے بھی بریفنگ کی کئی کلاسوں کو اٹینڈ کر چکے ہیں تو یہ فیصلہ ہوا کہ اگر آپ مشترکہ فیصلوں کے پابند ہیں اور سچ مچ آپ بلوچ یا بلوچستان کی نمائندگی کیلئے جا رہے ہیں تو ہمارے خیال میں آپ اسٹوڈنٹس نہیں ہیں کہ کسی کلاس کو اٹینڈ کریں یا کسی لیکچرار کا لیکچر سنیں۔ یہی جواب بلوچستان کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو دیا گیا کہ بریفنگ کیلئے ہم نہیں آئیں گے تو پھر ہمیں جواب ملا کہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر آپ کو اسلام آباد اس لئے بلا رہے ہیں کہ وہ آپ سے بلوچستان کے مسئلے پر بات چیت کریں گے اور رات کا کھانا آپ کے ساتھ کھائیں گے۔ تینوں حضرات چلے گئے، کھانے کی دعوت میں جو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی جانب سے دی گئی تھی۔ وہ گھنٹوں ان کے ساتھ رہے لیکن سرے سے بلوچستان کا مسئلہ زیر بحث ہی نہیں آ سکا۔ جیسے کہ بعد کے حالات نے واضح کیا کہ یاروں نے فیصلہ کیا ہوا تھا کہ حکومت سے بات چیت کو خیر بخش مری سے خفیہ رکھا جائے۔

ان یاروں نے پہلے ہی جنرل ضیاء کو سمجھا دیا تھا کہ خیر بخش مری کے سامنے بلوچستان کے متعلق کوئی بات نہ کی جائے۔ اس کے بعد بزنجو صاحب نے کئی ملاقاتیں کیں اور یہ حقیقت ہے کہ سردار عطاء اللہ مینگل کے درمیان اچھی خاصی خط و کتابت بھی رہی بالآخر کراچی میں بزنجو اور مینگل کی ملاقات جنرل ضیاء سے ہوئی، اس ملاقات میں بھی خیر بخش مری کی شرکت کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

اس تمام دوران میں نہ تو خیر بخش مری کو آگاہ کیا گیا نہ بلوچ عوام کو بات چیت کے بارے میں بتایا گیا البتہ اس دوران بزنجو صاحب کے کئی بیانات آئے۔ انہوں نے تصفیہ کی خوش خبری سنائی اور مکران میں جا کر عوام کو عام معافی پر پُرامن زمانے کا فیصلہ سنایا۔ اگرچہ یہ آپ کے سوال کا حصہ نہیں پھر بھی میں یہ بتاؤں کہ جب بزنجو صاحب تصفیہ کی خوش خبری اور عام معافی کا مژدہ لیکر مکران کے عوام کے پاس گئے تو لوگوں خصوصاً نوجوانوں نے کس تلخ اور بھونڈے انداز میں بزنجو صاحب کو جواب دیا۔ اس کے بعد جب کوئٹہ میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی آمد کے اعلان کے بعد جیسے کہ آپ صحافیوں نے اخبارات میں سرخیاں لگائیں تھیں کہ ''بلوچ ممتاز رہنما'' اور ''بلوچستان کے تین ممتاز'' لیڈروں کو بات چیت کی دعوت دے دی گئی ہے تو سردار عطاء اللہ مینگل اور بزنجو صاحب کراچی سے کوئٹہ آئے۔ بزنجو صاحب کافی

عرصہ سے تصفیہ کی خوشخبری بتا رہے تھے لیکن تصفیہ کو بلوچ عوام کے سامنے لے کر نہیں آئے۔ انہوں نے کہا کہ تصفیہ ہو چکا ہے، لیکن معاوضے کی رقم طے نہیں ہوئی ہے۔ میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اس ملاقات سے کچھ دن قبل بلوچستان کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر میجر جنرل غلام محمد نے اپنے بیان میں جو کہ انہوں نے پریس کو دیا تھا تنقید کا نشانہ خیر بخش مری کو بنایا تھا، دراصل یہ تصفیہ کنندگان کی ایک دھمکی تھی کہ خیر بخش مری ان کے اس خفیہ معاہدے کو بغیر تفصیلات پوچھے قبول کر لے۔

اس دوران جیسا کہ میجر جنرل غلام محمد کے بیان میں بھی تھا کہ سردار عطاء اللہ مینگل اور بزنجو کے وہ رشتہ دار اور دوسرے لوگ جن کی کل تعداد 16 تھی، وہ افغانستان سے واپس آ چکے ہیں وہ انہی سولہ افراد کو بلوچ قوم سمجھ کر ان کی نمائندگی کر رہے تھے۔ کوئٹہ پہنچتے ہی ایئرپورٹ پر رپورٹروں کے سوالات کے جواب میں سردار عطاء اللہ مینگل نے فرمایا کہ تصفیہ ہو چکا ہے لیکن بلوچستان کی افسر شاہی اس کو عملی جامہ پہنانے میں روڑے اٹکا رہی ہے۔ جب صاحب کا یہ بیان اخباروں میں شہ سرخیوں کے ساتھ چھپا تو کچھ بلوچ دوستوں نے بشمول خیر بخش مری کے سردار صاحب سے یہ سوال کیا کہ "یہ تصفیہ کس نے کیا؟ کب کیا؟ اور اس کے شرائط اور تفصیلات کیا ہیں؟ سردار صاحب نے فرمایا کہ پریس والے ان کی بات کو نہیں سمجھے۔ سردار صاحب نے فرمایا کہ انہوں نے نہ صرف تصفیئے کی بات نہیں کی بلکہ انہوں نے کہا کہ میں "بات چیت" کے لفظ سے نفرت کرتا ہوں۔ جہاں تک میری ذاتی معلومات ہے میرے خیال میں خیر بخش مری نے بزنجو صاحب کے ساتھ ملکر ملاقات کرنے سے انکار کیا اور اس میں اپنے اس فیصلے سے سردار عطاء اللہ مینگل کو بھی آگاہ کیا۔ ساڑھے تین گھنٹے کے طویل بحث مباحثے کے بعد یہ پایا کہ صرف اس بار خیر بخش مری کو ان کے ساتھ یکجا ملاقات کرنی چاہیئے اور خیر بخش مری بھی اس ملاقات میں ترجمان کی حیثیت سے شامل ہوگا۔ خیر بخش مری نے میری معلومات کے مطابق اس وقت اس سے اتفاق کیا اور کہا کہ میں فلاں، فلاں، فلاں بات کہوں گا لیکن جب ملاقات کے لئے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے دروازے پر یہ حضرات یکجا ہوئے تو خیر بخش کو یقیناً تعجب اور حیرانی ہوئی کہ یاروں نے بغلوں میں فائلیں دبائی ہوئی تھیں۔ دعا سلام کے بعد فوراً فائلیں کھولی گئیں اور یہ مطالبہ کیا گیا کہ آپ کے اور ہمارے درمیاں ہونے والے ایگریمنٹ میں جو شقیں تھیں ان پر آپ نے عمل درآمد نہیں کیا۔

Scanned with CamScanner

ساڑھے تین گھنٹوں کی بات میں تین گھنٹے صرف فائلوں کے تین مسائل پر بحث ہوتی رہی۔(1) بزنجو صاحب کی ششک کی بحالی (2) عزیزوں، رشتہ داروں اور چند دوستوں کے بارے میں جن کے نام بھی لئے گئے بتایا گیا کہ نہ تو انکو ملازمتوں پر بحال کیا گیا اور نہ نئی ملازمتیں دی گئیں ہیں۔(3) چند دوستوں کی زمینوں کی واپسی پر بات چیت ہوئی۔صرف آدھا گھنٹہ چیف سیکریٹری بلوچستان کے تبادلے پر گفتگو ہوئی۔اس ساڑھے تین گھنٹے کی ملاقات میں خیر بخش مری نے کوئی بات نہیں کی اور نہ مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے ان سے پوچھا، کیونکہ یہ باتیں بلوچ قوم کیلئے نہیں بلکہ ذاتی مراعات کیلئے باتیں تھیں۔

جب ملاقات سے باہر نکلے تو صحافیوں کے سوالات کے جواب میں بزنجو صاحب نے بات چیت پر نہایت جھوم کر مکمل اطمینان کا اظہار کیا۔راوی کہتے ہیں کہ خیر بخش مری نے بزنجو صاحب سے کہا کہ پریس والوں سے کہہ دیں کہ یہ صرف آپ کا اطمینان ہے بلوچ عوام کا نہیں۔سردار عطاء اللہ مینگل نے پھر افسر شاہی کے رویے کے بارے میں ناپسندیدگی کا اظہار کیا شاید ان کے ذہن میں چیف سیکریٹری کے تبادلے کے مطالبے کو نہ ماننے کا ردعمل تھا۔

دوسری رات چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے اپنی پریس کانفرنس میں اس سوال کے جواب میں فرمایا کہ یہ لوگ اندر کچھ کہتے ہیں باہر کچھ کہتے ہیں۔مزید انہوں نے یہ بھی اضافہ کیا کہ اگر سردار عطاء اللہ مینگل صاحب کو کوئی گلہ ہے یا شکوہ ہے تو وہ اپنی تکالیف کے بارے ڈپٹی کمشنر کو کہہ سکتے ہیں۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے ان فقروں سے خود واضح ہوتا ہے کہ ہمارے دوستوں کی اصل پوزیشن اور نامزدگی کی بنیادی حیثیت،''ممتاز بلوچ لیڈر یا بلوچستان کے ممتاز لیڈر'' کی حقیقت کیا تھی؟ اس کا جواب خود یار لوگ ہی دے سکتے ہیں۔یہ اور بات ہے کہ اگر خیر بخش مری کو دھوکے میں نہ رکھا جاتا تو خیر بخش مری کی طرف سے یہ تصفیہ ہو چکا تھا کہ وہ بات چیت کے دوران چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور پریس سے دست بستہ گذارش کریں گے کہ آئندہ ہم سے یہ بیہمانہ مذاق نہ کیا جائے کہ ہم بلوچستان کے ممتاز لیڈر رہیں یا بلوچی قوم کے لیڈر رہیں۔لیکن نامزد لیڈری کا امتیاز قائم ہی رہا کیونکہ ضخیم فائلیں خیر بخش مری کو خاموش رکھنے میں حائل تھیں۔

اس کے بعد سردار عطاء اللہ مینگل نے کراچی میں اخبار کے بیان میں کچھ خیالات کا اظہار فرمایا جس میں تصفیہ سے ناراضگی کا اظہار تھا اور یہ بھی کہ بلوچستان میں مارچ کی کسی تاریخ

Scanned with CamScanner

سے سرداریوں کو بحال کیا جائے جب کہ یہ ہمارا مطالبہ نہیں تھا۔ بزنجو صاحب نے اپنے اطمینان کے بعد اس بیان کو مثبت قرار دیا اور بعد میں ایک اور بیان میں فرمایا کہ ہم نے بار بار کی طویل ملاقاتوں میں کبھی بھی کوئی سیاسی بات کی ہی نہیں ہے۔ تو کیا بلوچ قوم اپنے ممتاز بلوچستان کے لیڈروں سے یہ پوچھنے کا حق رکھتی ہے کہ یار و بار بار کی طویل ملاقاتوں، تصفیہ کو خوشخبری اور عام معافی کے مژدہ سنانے کے باوجود آپ لوگوں کی اگر کوئی سیاسی بات چیت نہیں ہوئی تو کیا آپ بنٹے کھیلنے گئے تھے، تاش کھیلنے گئے تھے یا شطرنج کی بازی لگائی تھی؟؟ یہ سب بلوچ قوم کے ساتھ ظالمانہ مذاق ہے۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ جنرل ضیاء صاحب یہ نہیں بتاتے ہیں کہ بات چیت کیا ہوئی۔ اور نہ یہ دونوں حضرات یہ بتانے پر رضامند ہیں کہ کیا بات چیت ہوئی۔ البتہ اس پر اب تک حکومت اور یاران طریقت متفق ہیں کہ راز کو راز رہنے دیا جائے۔ نیاز کے بٹوارے میں شکررنجی پیدا ہوگئی کیونکہ نیاز کی تقسیم نیازمندیوں کی بنیاد پر ہوئی ہے۔ تو یہ ہے اس تصفیے اور بات چیت کی مختصر روئیداد۔ لیکن بلوچ قوم اور بلوچستان کے عوام چیخ چیخ کر مطالبہ کر رہے ہیں کہ نام نہاد تصفیے کی تفصیلات، شرائط اور نامزد رہنماؤں کے مطالبات کے ساتھ ساتھ اُس خط و کتابت سے بھی آگاہ کیا جائے جو بھٹو کے آخری دور میں 77ء کے شروع میں ہوئی تھی اور اس کے بعد اس تمام گفتگو کی تفصیلات بھی عوام کو بتائی جائے جو جنرل ضیاء الحق نے تصفیہ اور عام معافی کے سلسلے میں ان لیڈروں سے کی تھی۔ مجھے امید ہے کہ جنرل صاحب ان اندر کی باتوں سے جیسا کہ انہوں نے خود فرمایا ہے کہ یہ لیڈر اندر کچھ کہتے باہر کچھ، ان باتوں سے عوام کو آگاہ کریں گے یا پھر ممتاز رہنماؤں کی راز نیاز کی بات اور تصفیہ کی تمام مکمل تفصیلات سے بلوچ قوم اور پورے پاکستان کے عوام کو ضرور آگاہ کریں گے۔

لودھی: کیا بلوچستان پاکستان سے علیحدہ ہونا چاہتا ہے؟

مری: میرے خیال میں بلوچستان میں علیحدگی کی کوئی تحریک نہیں ہے، یہ تحریک صرف اور صرف قومی تحریک ہے۔ لیکن بلوچستان کو آج تک وہی سزا دی گئی جو آزاد بنگلہ دیش کے عوام کو دی گئی تھی۔ درحقیقت ملک کے خودغرض اور مفاد پرست عناصر دوسرے صوبوں کے عوام کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ بلوچ عوام پر الزام لگا رہے ہیں کہ ان مفاد پرست سیاستدانوں نے بنگالی عوام کے حق خودمختاری کو اس لئے تسلیم نہیں کیا تھا کہ اگر تسلیم کر لیتے تو وہ مشرقی صوبے کا استحصال نہیں کر سکتے تھے۔ صوبائی تعصب اور نفرت خودغرض اور مفاد پرست عناصر کیلئے فائدہ

مند ہے کیونکہ ان خطوط پر زور دینے سے عوام وقتی اور عارضی طور پر صحت مند طبقاتی سیاست اور معاشیات کو تو بھول جاتے ہیں۔ اس وقت ہمارا حکمران طبقہ طبقاتی جنگ کا رخ موڑنے کیلئے مذموم حرکات اور گمراہ کن پروپیگنڈہ کر رہا ہے۔

لودھی: پاکستان اس وقت زبردست سیاسی بحران کا شکار ہے۔ آپ اس بحران پر روشنی ڈالیں؟

مری: اس وقت پاکستان شدید بحران سے دوچار ہے اور ہونا بھی چاہئے کیونکہ پاکستان جیسی ریاست اور اس کے ریاستی ڈھانچے کی ساخت جن طبقاتی اور قومی اضداد پر قائم ہے ایسی ریاستوں میں ہر دو چار سال کے بعد بحران کا آنا تاریخی طور پر لازمی ہے، بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ بحران ایسی ریاستوں کا مقدر ہے۔ اب اگر میں ان تفصیلات میں جاؤں تو پاکستانی ریاست کا ڈھانچہ، اس کا پس منظر، اس کی تشکیل اور ان معاشی، سماجی اور سیاسی بحرانوں کا تذکرہ کروں تو مجھے برصغیر کی ہزاروں برس کی تاریخ کو لینا ہوگا۔ ظاہر ہے پھر انٹرویو اتنا طویل ہوگا کہ اس کو چھاپنا رسالوں کے بس کی بات نہیں ہوگی بلکہ کئی جلدوں کی ضرورت ہوگی۔ تو میں پاکسان کے بحران کو ہی لیتا ہوں جیسا کہ میں نے بتایا ہے کہ بحران ایسی ریاستوں کا مقدر ہے، جب بھی بحران آتا ہے ریاست کے مالک استحصالی طبقات اور سامراجی ریاست کی ہی جابر اور ظالم مشینری اس بحران اور ان تصادات کو معتدل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ بلکہ ان کے پاس حل ہوتا ہی نہیں، حل صرف اور صرف عوام کے پاس ہوتا ہے۔ لیکن عوامی حل کیلئے عوامی فکر کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ ''آوارہ گرد'' عوامی فکر دینے میں ناکام ہیں تو اب اسے معتدل کرنے کیلئے ریاستی آقاؤں کے پاس دو ہی حربے ہونگے: (1) فوجی آمریت (2) نام نہاد جمہوری آمریت۔ یہ دونوں وقت اور ضرورت کے مطابق یکے بعد دیگرے سامراج کے مفادات اور اس کی ہی پھیلائی ہوئی ڈور کے مطابق نمبروار آتے ہیں۔ جو آتا ہے وہ اپنا وقت صرف اپنے پیش رو کو کوسنے میں صرف کرتا ہے۔ دراصل وہ یہ بین اس لئے کرتے ہیں کہ وہ استحصالی ریاست کے جبر و ظلم کو چھپانا چاہتے ہیں، تاکہ ظالم اور جابر ریاست کو اتنا مہربان ثابت کیا جائے کہ اس میں کوئی خامی ہے ہی نہیں اور نہ ہی کوئی بُرائی ہے، بلکہ تمام خامیاں اور برائیاں حکمران فرد واحد میں تھیں۔ پھر تمام استحصالی طبقے اور ان کے سیاسی نمائندے نام نہاد استحصالی طبقات کی پارٹیوں کو جمہوری اور طرح طرح کے نام دے کر چیخنا چلانا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ آئینی بحران ہے، حالانکہ اس ملک میں نہ کبھی کوئی آئین تھا اور نہ آج ہے۔ آئین کی تعریف

Scanned with CamScanner

برسرِ اقتدار حکمران گروہ خود کرتا ہے اور جب اقتدار سے محروم ہوتا ہے تو وہ اپنا بنایا ہوا آئین اور آرڈیننس سب اپنی جیب میں ڈال کر چلتا بنتا ہے۔ البتہ اس کو بھی ایک آئین کہہ سکتے ہیں کہ جو 47 سے لیکر آج تک قائم ودائم ہے۔ اس پر ماضی کے اور حال کے حکمران راضی ہیں۔ جسے نہ ماضی میں چھیڑا گیا اور نہ حال میں چھیڑا جائے گا۔ یہ وہ متفقہ آئین ہے جس میں طبقات اور مظلوم قومیتوں کا استحصال یا مختصر الفاظ میں جاگیرداروں اور گماشتہ سرمایہ داری کی بیقراری اور سامراج کے مخصوص مفادات مضمر ہیں، اور آج کا بحران بھی ایسا ہی ایک شدید انقلابی بحران ہے۔ گو کہ اقتدار اور اختیار کے خوفناک ہتھیاروں سے اسے ''آئینی بحران'' کا نام اور صورت دینے کی کوشش کی جارہی ہے جب کہ موجودہ شدید بحران آئینی نہیں بلکہ سماجی اور سیاسی بحران ہے۔ جب معاشی، سماجی اور سیاسی بحران یکجا ہوجاتے ہیں تو وہ انقلابی بحران ہوتا ہے۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ بحران کو معتدل کرنے کیلئے ریاستی آقاؤں کے پاس دو ہی شعبدے ہوتے ہیں: فوجی آمریت اور نام نہاد جمہوری آمریت جو وقت اور حالات کے تحت یکے بعد دیگرے لائے جاتے ہیں۔ ایوب آمریت کے بعد بھٹو عوامی آمریت لائی گئی۔ بھٹو جمہوری آمریت کی جگہ ''فیئر پلے'' کے تحت مارشل لاء لگایا گیا اور ''نظام مصطفیٰ، نظام الٰہی اور نظریہ ضرورت'' سب نعروں میں انتخابات کا مطالبہ کیا گیا اور کیا جارہا ہے۔ تاریخ کے ایک طالب علم کو ہنسی آتی ہوگی۔ جمہوریت کا مطالبہ کرنے والے نام نہاد جمہوریت نواز لیڈر صاحبان کا مطالبہ جمہوریت اس کو یوں لگتا ہوگا کہ ایک 90 سالہ بوڑھا کراچی کی زیب النساء اسٹریٹ میں چیخ چیخ کر پکار رہا ہو کہ کہاں گئی میری والدہ مجھے دودھ پلائے۔ بھائی میرے! ان دونوں آمریتوں کی جن کے بارے میں میں نے بتلایا ہے کوئی معیاد نہیں ہوتی، یہ مدارج کے تحت نمودار ہوتی ہیں اور مدارج کی ایک خاص سطح تک آنے پر ایک کی جگہ دوسری لے لیتی ہے۔

آپ نے دیکھا کہ جمہوریت کے علمبردار اور انتخابات کے ڈھنڈورچی کل ہی تو اسلام آباد میں اسلام بی بی کی گود میں جا بیٹھے تھے، تاریخ کے مطالعہ سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ جب ان دونوں شعبدے بازوں کو عوام رد کرتے ہیں تو ریاستی ڈھانچہ چیخنے لگتا ہے۔ اسی لئے اب ان لوگوں نے مل کر قوم کے بغیر ہی ایک قومی حکومت بنالی ہے اور اپوزیشن کے مورچے میں عوامی قوتوں کے خطرے کو ٹالنے کیلئے اپنے میں ہی سے کچھ کو بٹھا دیا گیا ہے۔

لودھی: احتساب اور حکومت کی طرف سے نافذ ہونے والے اسلامی نظام کے بارے میں آپ

کا کیا خیال ہے؟

مری: جہاں تک احتساب کا تعلق ہے میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ احتساب کا مطالبہ کرنے والوں اور احتساب کرنے والے مجاز صاحبان کا مطلب کیا ہے؟ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ نہیں کہتے۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ کوشش یہ کی جاتی ہے کہ ریاستی جبر وظلم کو فرد کے جبر وظلم کا روپ دیا جائے تاکہ استحصالی ریاست کے گھناؤنے اور خوفناک چہرے کو چھپایا جاسکے۔ اگرچہ بھٹو کی حکمرانی کے دوران سب کچھ صرف اور صرف بھٹو کا کیا ہوا ہے تو جہاں نواب محمد احمد خان کے قتل اور اسی قسم کے دوسرے چند ایک واقعات کا احتساب کیا جاتا ہے تو اسی دوران پانچ برس کے عرصے میں بلوچستان میں آگ اور خون کی عام ہولی کھیلی گئی ہے اس کا احتساب کرنے کے بجائے عام معافی کا ظالمانہ مذاق کیوں کیا جاتا ہے۔ بلوچ عوام اور بلوچ قوم کا ہی صرف یہ مطالبہ نہیں ہے کہ جو کچھ بلوچستان میں ہوا اس کا احتساب کیا جائے بلکہ یہ خود پاکستان کے ساڑھے سات کروڑ عوام کی فلاح و بہبود اور ملک کی سالمیت کیلئے انتہائی ضروری ہے کہ بلوچستان میں جو کچھ ہوا اُس کا احتساب کیا جائے۔ جب احتساب کی تشریح، اُس پر عمل درآمد سب پسند اور ناپسند کے دائرے میں کئے جائیں تو پھر یہی ہوتا ہے۔ بھوک پھیلانے والوں کے بجائے بھوکوں کو کوڑے مارے جاتے ہیں، گراں فروشوں کے بجائے مہنگائی تلے دبے اور پسے ہوئے عوام کو کوڑے مارے جاتے ہیں۔ اس سے بھی بات نہیں بنتی تو بلوچستان کے نام نہاد تصفیے کے اطمینان بخش بیانات کے باوجود مجبور ہو کر کہنا پڑتا ہے کہ ہم نے کوئی سیاسی بات چیت نہیں کی۔ جہاں تک آپ کا سوال ''اسلامی نظام'' کے نفاذ کا تعلق ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ نہ تو آپ اس سوال کے بارے میں کچھ جانتے ہیں نہ مجھے اس کی تفصیلات کا علم ہے، کیونکہ اس نعرے کے موجد اور اسکو نافذ کرنے کے دعویدار خود اسلام کی ایک دوسرے سے بالکل مختلف تشریح کرتے ہیں۔ تاریخ کبھی بھی اپنے ماضی کی بھیک کسی بھکاری کو نہیں دیتی اور نہ ہی تاریخ کے ماضی کے بھکاری حال اور مستقبل کے جدید انسان کو گمراہ کرسکتے ہیں۔ البتہ اپنی انا کی تسکین اور مخصوص مفادات کی خاطر آج مذہب کو ریاست کا شریک جرم بنانے کی کوشش کر رہے ہیں تو یہاں بھی اسلام کے تبرک کا وہی حشر ہوگا جو یورپ میں جاگیرداری کے ساتھ چرچ کا ہوا تھا، کیونکہ عوام کی نفرت استحصالی ریاست کے گھناؤنے چہرے سے ہے جسے مذہب کے پردے کے پیچھے چھپانے کی کوشش کی جائے گی۔ تو عوام کی

Scanned with CamScanner

نفرت کا ٹکراؤ ریاست کے بجائے مذہب کے تبرک ہوگا۔ جیسا کہ یورپ میں ہوا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ کنوئیں کے مینڈک آج کے سائنسی دور میں بھی اس خوش فہمی کا شکار ہیں کہ وہ آج کے جدید دور میں انسانوں کو کوڑے مار مار کر ڈنڈوں سے پیٹ پیٹ کر بہشت میں لے جائیں گے۔

لودھی: افغانستان کے انقلاب کے بارے میں آپ کے کیا تاثرات ہیں؟ اس انقلاب کے اثرات کسی حد تک پڑوسی ممالک پر پڑیں گے؟

مری: جہاں تک افغانستان کے انقلاب کا تعلق ہے وہ افغانستان، ایران ، پاکستان اور ہندوستان غرض اس پورے خطہ کا انقلاب ہے۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ افغانستان کا عوامی انقلاب اس خطہ کی صدیوں کی تاریخ کا پہلا مثبت اور سنہرا باب ہے۔ شاید اس خطہ کی آنے والی تاریخ میں اپریل 78ء ناقابل فراموش باب رہے گا۔ جہاں تک اس کے اثرات کا پڑوسی ملکوں سے تعلق ہے وہ تو آپ نے رجعت پسندوں کی بوکھلاہٹ، ان کے فتوؤں اور قرآن خوانیوں اور غائبانہ نماز جنازہ میں دیکھ لیا اور پڑھ لیا ہوگا کہ اس کے مثبت اثرات کتنے فوری اور کیسی تیزی سے اپنے پڑوسی ملکوں کے عوام اور ریاستی ڈھانچوں پر اثر انداز ہوئے ہیں کہ کنوئیں کے مینڈکوں نے کنوؤں سے نکل کر یہ ٹرانا شروع کر دیا ہے کہ یہ ملحد ہیں، یہودی ہیں، لیکن ان فری ایڈوائزروں سے پاکستانی عوام یہ پوچھ سکتے ہیں کہ جہاں تم نے افغانستان میں شہید ہونے والے مسلمانوں کی نماز جنازہ ادا کی اور قرآن خوانیاں کیں، کیا تم لوگوں نے بلوچ مسلمانوں کی حاضر لاشوں پر کوئی نماز جنازہ پڑھائی یا غائبانہ نماز جنازہ کی ضرورت محسوس کی تھی؟ ان کیلئے کوئی قرآن خوانی کی تھی؟ جب کہ بلوچ شہداء مسلمان بھی تھے اور پاکستانی بھی۔ یہ مانا کہ یہ آپ کی خواہش نہیں تھی اور نہ آپ کی ضرورت، یہ سامراجی آقا کی ہدایت تھی جس کی تکمیل کیلئے آپ ظاہری اور اندرونی طور پر طرح طرح کے پاپڑ بیل رہے ہیں۔ یہ میں پاکستانی عوام کو بتانا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ پاکستان نظریاتی قوتوں اور مملکتوں کے ٹکراؤ کے اکھاڑہ بننے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔

اس کے ساتھ میں رجعت پسندوں سے بلا روک ٹوک یہ کہنا چاہتا ہوں کہ انسانی تاریخ کے پہیہ کو گھما کر صدیوں پیچھے لے جانا فری ایڈوائزروں، جاگیردار، گماشتہ سرمایہ دار اور ان کے آقا سامراج کے بس کی بات نہیں۔ آپ کا یہ پوچھنا کہ پڑوسی ملکوں پر فوری اثرات کیا

ہوئے ہونگے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں کے عوام پر افغانستان کے عوامی انقلاب کے گہرے اثرات ہوئے ہیں۔ جیسا کہ ایک صحافی کی حیثیت سے آپ کو مجھ سے زیادہ دیکھنے اور سننے کا موقع ملا ہوگا کہ افغانستان کے انقلاب کے بارے میں یہاں کے عوام اور عوامی تنظیموں نے کس کس طرح کے تاریخ ساز نعرے لگائے ہیں اور میں یہاں تک آپ سے کہوں گا کہ ہر عوام دوست فرد کا یہ فرض بنتا ہے کہ جو بھی رجعت پسند ہاتھ سامراج کے اشارے پر جدید انسانی اور انسانیت کی عظمت اور مستقبل کی طرف اٹھے اس کو ہر قیمت پر پکڑنے کی کوشش کریں۔ میں ذاتی طور پر افغانستان کے عوام اور عوامی انقلابیوں کو افغانستان عوامی انقلاب پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

لودھی: ایران میں شہنشاہیت کے خلاف جو جدوجہد ہو رہی ہے اس کو آپ کس نگاہ سے دیکھتے ہیں؟

مری: جہاں تک ایران کے بارے میں آپ کے سوال کا تعلق ہے میں اسے اپنی بجائے تاریخ کے نقطہ نگاہ سے دیکھوں گا۔ ایران ایک کثیر القومی، مطلق العنان شاہی ریاست ہے۔ جہاں پر مظلوم قوموں اور مظلوم طبقات پر صدیوں سے وہ مظالم ڈھائے جارہے ہیں، جن کا فکری نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ملوکیت اور شہنشاہیت کے خلاف وہاں کے عوام، مظلوم قومیں اور عوام دوست پارٹیاں، ایک صبر آزما اور تھکا دینے والی جدوجہد کو مسلسل جاری رکھیں۔ تاریخ کی روشنی میں یہ ایک سنہرے مستقبل کیلئے اس جدوجہد کی ایک کڑی ہے جو آج ایران میں کھل کر سامنے آرہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایران میں موجود عوامی جدوجہد کو افغانستان کے انقلاب سے ایک ہمدردانہ اور مثبت شہ ملی ہے۔ گو سامراج اپنے ایشیاء کے اس ذیلی سامراج کو بچانے کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہے۔ لیکن تاریخ اس کے مقدر میں وہی فیصلہ دے چکی ہے جو ویتنام۔ کمبوڈیا۔ لاؤس۔ افریقہ۔ گنی بساؤ۔ موزمبیق۔ انگولا اور خود افغانستان میں لکھا جا چکا ہے۔ جہاں تک پوری دنیا کے عوام اور عوام دوست تحریکوں کا تعلق ہے ان کی تمام تر ہمدردیاں ایران کے عوام کے ساتھ ہیں۔

لودھی: آپ نے BSO کے کنونشن میں خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ایران بلوچستان میں مداخلت کر رہا ہے، اس کی مداخلت کس قسم کی ہے؟

مری: سب سے پہلے تو میں آپ کو یہ بتاؤں گا کہ ایرانی عوام نے بلوچ عوام کے خلاف کبھی

کوئی مخالفانہ کاروائیاں یا مداخلت نہیں کی، البتہ ایرانی حکومت اور اس کے حواریوں نے آج سے نہیں بلکہ تاریخ کے ایک طویل عرصے سے بلوچ قوم اور بلوچ عوام دوست تحریکوں اور نمائندوں کے خلاف ہر سازش اور کارروائی کی ہے، یہ بلوچ خواہ ایرانی بلوچستان سے تعلق رکھتے ہوں چاہے پاکستانی بلوچستان سے۔

مجھے قطعی طور پر علم ہے کہ آج کل پاکستان بھر میں خصوصاً بلوچستان اور سندھ میں ایران کا خفیہ ادارہ جس کو رسوائے زمانہ ''ساواک'' کے نام سے پکارا جاتا ہے انتہائی سرگرم ہے۔ ساواک کے اہم عہدیدار اس وقت پاکستان میں بیٹھے ہیں۔ قطع نظر اس کے بلوچ عوام دوست رہنماؤں، کارکنوں اور بلوچ طلباء آرگنائزیشن (دونوں گروپ) کی ایک طویل فہرست بنائی گئی اور انہیں راہ سے ہٹانے کیلئے نام نہاد حکومت سے تعاون کرنے والے جرائم پیشہ افراد کو ایران کا بنا ہوا اسلحہ، کارتوس اور رقم بھاری تعداد میں تقسیم کی جارہی ہے اور یہ بھی اندیشہ ہم لوگ محسوس کر رہے ہیں کہ پھر بھی اگر ضرورت پیش آئے تو ان جرائم پیشہ افراد جن کو اسلحہ مہیا کیا گیا ہے کی مدد کیلئے تنخواہ دار تربیت یافتہ افراد کو بھی قبائلی رنگ میں شامل کیا جاسکتا ہے، ایسا ہو رہا ہے۔ مجھے یہ بھی اطلاعات ملی ہیں کہ پاکستان میں سرگرم بعض غیر ملکی عناصر کو ناپسندیدہ بلوچوں کی فہرستیں فراہم کی گئی ہیں تاکہ یہ لوگ بلوچستان کے انقلابیوں کا صفایا کرسکیں۔ لیکن ہم بتادینا چاہتے ہیں کہ یہ 72ء یا 73ء نہیں بلکہ 78ء ہے۔ جو ہاتھ ہماری جانب بڑھے گا ہم اس کو روکیں گے۔ ہماری زندگی میں اگر کچھ نہیں ہوا تو ہمارے مرنے کے بعد بہت کچھ ہوگا۔

لودھی: کیا آپ پاکستان میں بائیں بازو کے مختلف گروپوں میں اتحاد کے حامی ہیں، اگر ہیں تو اس سلسلے میں آپ کا کیا رول ہے؟

مری: میں صرف اتنا کہوں گا کہ ہاں۔ جہاں تک رول کا تعلق ہے تو میری تمام تر حمایت صحیح معنوں میں بائیں بازو کا اتحاد کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

لودھی: ملک کے عوام کیلئے کوئی پیغام!؟

مری: میرا پورا انٹرویو ملک کے مظلوم، دکھی، غریب کسان، مزدور، طلباء اور دانشوروں کیلئے ایک پیغام ہے۔

(ماہنامہ ''رازدان'' کراچی 1978ء)

Scanned with CamScanner

قومیتوں کو حقوق دیجیے!

کسانوں اور محنت کشوں کی عظمتوں کو تسلیم کیجیے!

ماہنامہ "صحافت" کو انٹرویو

شیر محمد مری بلوچستان کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ برس ہا برس سے بلوچستان کے حقوق کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ خود ایک عملی آدمی ہیں۔ صرف تقریریں ہی نہیں کرتے بلکہ گیارہ سال سے پہاڑوں پر بندوقیں سنبھالے بقول ان کے جنگ کے خاتمے کے لیے جنگ لڑتے رہے۔ ایک روز پہاڑوں سے اپنے گھر لوٹے تو گاؤں میں شاندار استقبال ہوا۔ گاؤں بھر کے بچے اور بڑے ایک صف میں ہاتھ ملانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ہر شخص اپنی باری پر تعارف کرواتا کہ میں فلاں کا بیٹا ہوں۔ ایک بچے نے کہا میں شیر محمد مری کا بیٹا ہوں!

شیر محمد مری نے اس بچے کو گلے سے لگا لیا۔ بچہ اس کا اپنا تھا۔ شیر محمد مری گوریلا جنگ کے لیے نکلے تو اس وقت یہ بچہ تیس دن کا تھا، لیکن جب واپس آئے تو اس کی عمر گیارہ سال تھی۔

شیر محمد مری تیرہ برس کا عرصہ جیل میں رہے، جب پڑھا اور سوچا!! ان کی شخصیت اور عمل میں دوغلا پن نہیں ہے۔ جو کچھ بھی ہے صاف ہے، سامنے ہے۔ کئی کتابیں بھی لکھ چکے ہیں، لیکن اس وقت کے حاکموں نے صرف ان کو قید کرنے پر بس نہیں کیا، بلکہ ان کی کتابوں کے مسودے بھی ضبط کر لیے۔ انہوں نے اپنی ایک سرگذشت بھی مرتب کی تھی، لیکن پولیس نے عوام کی بھلائی کی خاطر اسے چھین لیا۔

قومی اتحاد کے بچے کھچے رہنماؤں کی وفائی کابینہ میں شمولیت پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

"اس قسم کی ٹیسٹ ٹیوب کابینہ بحران پر قابو پانے کا حل نہیں"

Scanned with CamScanner

''مری صاحب! اسی قسم کی صوبائی کابینہ بلوچستان میں بھی تشکیل دی جا رہی ہے۔ وہاں ردِ عمل کیا ہوگا؟''

''وہی ردِ عمل ہوگا جو پورے پاکستان میں ہے، لیکن اتنا یاد رہے کہ بلوچستان نسبتاً حساس صوبہ ہے۔''

ہمارے اس استفسار پر کہ پاکستان کی حالیہ سیاست میں کیا تبدیلیاں سامنے آنے والی ہیں، انہوں نے کہا:

''میں نے ہمیشہ کہا ہے کہ پاکستان کو قائم رکھنا ہے تو اقتدار میں سات کروڑ عوام کو ساتھ لے کر چلیے۔ ڈنڈے کے ذریعے حکومت مت کیجئے بلکہ لوگوں کو پیار سے اپنا حکمران تسلیم کروائیے۔ یہ ملک کسی ایک گروہ یا ٹولے کی جاگیر نہیں اور جب تک اس ملک میں قومیتوں کے حقوق تسلیم نہیں کیے جائیں گے، نفرتوں کی دیواروں کو نہیں گرایا جائے گا، لوگوں میں وطن کی محبت کا احساس پیدا نہیں ہوگا۔ مزدوروں اور کسانوں کی عظمت کو تسلیم کیجئے، بلکہ انہیں تحفظ دیجئے۔ آزادیٔ تحریر و تقریر دیجئے! عزت نفس کو تحفظ دیجئے! یہ ملک محفوظ رہے گا۔ اسے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ ہمارے ملک کو بیرونی خطرات کا نہیں، اندرونی سامراج کے فسادات کا سامنا ہے، ورنہ ہو سکتا ہے کہ البدر اور الشمّس کے نعرے لگا کر یہ لوگ اس ملک کو بھی کھو دیں۔ ان کا کیا جاتا ہے۔ ایک نیا پاکستان بھٹو نے بنایا۔ ایک جدید پاکستان یہ بنالیں گے اور جدید ترین پاکستان کوئی اور آ کر تخلیق کر دے گا۔''

گفتگو کا موضوع ایک بار پھر نو تشکیل شدہ وفاقی کابینہ کی طرف جا پہنچا۔ انہوں نے انتہائی غصے کے عالم میں پہلو بدلتے ہوئے کہا ''سیاسی بونے میر علی احمد تالپور بھی وزیر بن گئے۔ جنرل ضیاء صاحب کہتے ہیں کہ میں اقتدار پر فوج کی مدد سے آیا ہوں: اور میں انہیں وزارت پر بٹھا رہا ہوں۔ بھائی اس میں جمہوریت کہاں سے آ گئی۔ موجودہ وزارتیں تو سیدھی سادی نوکریاں ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ جاگیرداری نپتی نظر نہیں آ رہی، اس لیے ایک ایسا منصوبہ بنایا گیا کہ سرمایہ داری بھی رہے، اور جاگیرداری بھی۔ آج داؤد احمد اپنے کارخانوں کا افتتاح کرتا ہے تو مولوی کو بلاتا ہے۔ مشینوں میں تعویز کو کیا دخل، لیکن افتتاح قرآن کی آیتوں سے ہوتا ہے۔ دراصل یہ فریب کے سلسلے میں۔ جاگیرداری کو بچانے کے آخری حربے استعمال ہو رہے ہیں، منصوبہ یہ ہے کہ پیوند لگاؤ۔ اگر ایک ناکام ہو جائے تو دوسرا لگاؤ۔ اصغر خان اور مزاری کو تیار

Scanned with CamScanner

رکھو! ایک ناکام ہو جائے تو دوسرے کو تیار رکھو، لیکن مسئلے، اس طرح حل نہیں ہوں گے ایسی تباہی آئے گی کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔"

ہم نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے ان سے پوچھا کہ چند روز سے بلوچستان کے بعض رہنما صوبائی خودمختاری کے مسئلے کو پھر سے ہوا دے رہے ہیں۔ آپ کے خیال میں کیا ان کے حالیہ بیانات کا کوئی سیاسی پس منظر ہے؟

"ہمارے ملک میں آئین کا پس منظر تو چھوڑیئے، منظر ہی نہیں۔ آئین تو اس ملک میں کبھی رہا نہیں۔ کوئی آئین تھا نہ ہے جو آیا اپنا آئین اپنے ساتھ لے کر آیا او واپس گیا تو اپنی رسوائیوں کے ساتھ ساتھ آئین کو بھی رسوا کر گیا۔ اس ملک کا ایک ہی آئین ہے کہ خوب استحصال کرو۔ آپ ہی بتائیں گذشتہ اکتیس سال میں کتنے ہزار ریگولیشن اور آرڈیننس آئے ہیں۔ آپ ان کا شمار تو کیجئے!! اور صوبائی خودمختاری خود ایک دھوکہ ہے، لوگوں کو گمراہ کرنا ہے، آپ قومی خودمختاری دیجئے۔

"آپ آئین کی کیا بات کرتے ہیں۔ آپ ذرا یہ تو بتائیں کہ آئین بنانے والوں اور اس پر دستخط کرنے والوں کا کیا حشر ہوا۔ بلوچستان کے رہنما آئین پر دستخط کرنے کے چند یوم بعد جیل میں پہنچ گئے۔ جس کے پاس پیسے ہیں، دولت ہے، طاقت ہے اس کا آئین چلتا ہے، وہی اصل حکمران ہے۔ عوام کو تو آئین کے نام پر بے وقوف بنایا جاتا ہے، اس وقت تک بنا جاتا رہے گا جب تک وہ اپنے آپ کو خود نہیں سمجھتے اور اپنے مسائل کو نہیں سمجھتے۔ بنگال کے لوگوں نے ڈٹ کر پاکستانی فوج کا مقابلہ کیا، لیکن جنرل ضیاء الرحمن کے چار سو فوجیوں کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔"

"این۔ڈی۔پی کے حالیہ سیاسی کردار کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

انہوں نے کہا "این، ڈی، پی بھی جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی ملی بھگت کے لیے استعمال ہو رہی ہے، یہ جعلی اپوزیشن کا کردار ادا کر رہی ہے تاکہ دونوں مورچوں پر ان کے وفاداروں کو بٹھا دیا جائے۔ اس طرح ترقی پسندوں کے آگے بڑھنے کے راستے مسدود ہو جائیں۔ لیکن بند باندھنے سے کام نہیں چلے گا۔ کرنا صرف یہ ہے کہ آپ تضادات کو ختم کیجئے، ورنہ آج کے حالات میں تو ایک بلوچ تمام مظالم کے باوجود بھی اپنے بلوچ سردار کی حمایت کرے گا، کیونکہ ہمارے یہاں انسان کو باہم تقسیم کر دیا گیا۔

Scanned with CamScanner

''لیکن مری صاحب! سیاسی تنگ نظری اور نفرتوں کو ختم کرنے کا طریقہ کیا ہے؟''

''قومیتوں کو حقوق دیجئے، کسانوں اور محنت کشوں کی عظمت کو تسلیم کیجئے! وہی آپ کا اور ہمارا خالق ہے، وہی رزق مہیا کرتا ہے، عوام کو آزادی دیجئے!

''۳۱ برس میں ۱۳۱ نظریے آئے۔ پاکستان میں کتنے لوگوں نے قربانی دی۔ اب احتساب ہو رہا ہے، لیکن ابدرا اور الشمس کا احتساب کیوں نہیں ہوتا۔ انہوں نے تیس لاکھ مسلمان بنگالیوں کو شہید کیا، لیکن ان کا احتساب کیوں نہیں ہوتا۔ بلوچستان کے پہاڑ خون میں نہاتے رہے۔ یہاں کے گھر اجڑتے رہے۔ انسان مرتے رہے!! اس کا احتساب کوئی نہیں کرتا بلکہ احتساب نواب احمد خان کے قتل کا ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ نواب تھا۔ کیا نواب احمد خان کے سوا کوئی بھی پاکستانی نہیں!! میں صاف بات کہوں گا۔ بے خوف وخطر کہوں گا۔ آپ کے ملک میں کتنے ریگولیشن ہیں اور کہاں کہاں حاوی ہوتے ہیں۔ میں ان چیزوں سے بے نیاز ہوں۔ زیادہ سے زیادہ ایک اداریہ ہی آجائے گا میرے خلاف۔ ٹھیک ہے۔ آجائے مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔ مجھے کسی سے حب الوطنی کا سرٹیفیکیٹ نہیں چاہیئے، اس لیے کہ مجھے کرسی کی طلب نہیں۔ کرسیاں ہمارے عزم کو ہلا نہیں سکتیں۔ پہلے تو مجھے اپنے وجود پر شک تھا، لیکن بعد میں ان کی گالیوں نے مجھے احساس دلایا کہ میں ہوں!!''

شیر محمد مری کی پیدا کی ہوئی جذباتی فضاء کو تبدیل کرنے کے لیے ہم نے ان سے ماضی کی سیاست کا ایک سوال کر ڈالا کہ نیپ کے دورِ حکومت کو آپ کیا نام دیں گے؟

کہنے لگے!'' بنگال میں مجیب جیتا تھا۔ مغربی پاکستان میں جاگیردار جیتا تھا۔ میں نیپ کا ممبر کبھی نہیں تھا اور نہ آج ہوں۔ نیپ کے دورِ حکومت میں بلوچوں کو ان کے حقوق نہیں ملے۔ نیپ اپنے ڈھانچے میں رجعت پسند پارٹی تھی۔ وہ کاغذی لفاظی کرتی تھی۔ وہ اپنی ہیئت میں بلوچوں کے لیے مخلص نہیں تھی۔ بلوچستان میں آج تک بلوچوں کی حکمرانی نہیں رہی بلکہ وہاں کی افسر شاہی حکمران رہی ہے۔ بلوچستان کے افسران مخصوص فکر اور گروہ سے تعلق رکھنے والے ہیں یہ لوگ کل بھی مظلوم طبقات پر مظالم کے چیمپئن تھے اور آج بھی ہیں۔ عوام اور مظلوم قومیتوں سے کہوں گا کہ وہ انہیں پہچاننے میں غلطی نہ کریں۔''

ہم نے اگلا سوال کیا: آج بھٹو جس مقام پر کھڑا ہے اور اس کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

Scanned with CamScanner

شیر محمد مری نے بھٹو کے لگائے ہوئے زخموں کو کریدتے ہوئے کہا:

''یہ ایک سلسلہ ہے۔ آپ پسند کریں یا نہ کریں ہر آنے والا اپنے مخالف کے ساتھ یہی کرتا ہے۔ میں اس کی مخالفت کرتا ہوں، لیکن نہیں کر سکتا، کیونکہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ بھٹو کی حمایت کرتے ہیں۔ میں بھٹو کی حمایت کیسے کروں۔ اگر میں مارشل لا کی مخالفت کروں تو مجھے کہا جائے گا کہ آپ بھٹو کی حمایت کررہے ہیں۔ آپ آخر دو برائی میں سے ایک برائی کے انتخاب کا موقع کیوں دیتے ہیں۔ آخر اچھائی کے انتخاب کا موقع کیوں نہیں دیتے۔ میں کسی بھی فرد کے خلاف غیر معمولی مقدمہ چلانے کے خلاف ہوں۔ میں مارشل لاء کے خلاف ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ملک سات کروڑ افراد کا ملک ہے۔''

جواب میں تشنگی محسوس کرتے ہوئے ہم نے شیر محمد مری سے پوچھا: ''پیپلز پارٹی کے حلقے یہ تاثر دے رہے ہیں کہ بھٹو نے عوام کو بیدار کیا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟''

''عوام کو بیداری کوئی نہیں دے سکتا!! آج تو بھٹو جیل میں ہے، پھر اس قدر بیداری کیوں ہے؟۔ میرے بھائی! بیداری خود آتی ہے۔ مسائل کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔ یہ کوئی بچہ تو نہیں کہ جو چاہے جن دے اور بھٹو کی تو خود بھی کوئی سوچ نہیں تھی۔ وہ کہاں سے خود سے بیداری دیتا۔ آج عوام کا کوئی لیڈر نہیں، لیکن یہی عوام جنہوں نے قومی اتحاد کی حمایت کی تھی، آج وہ ان پر ''گندے انڈے'' کیوں پھینک رہی ہے۔ یہ بیداری بلوچستان کے بحران نے وہاں آپ نے فوجی آپریشن پر روز ایک کروڑ روپیہ خرچ کیا اور اپنے ہی عوام کو فتح کرتے رہے جس کے نتیجے میں مہنگائی نے جنم لیا۔ یہ بلوچستان کی بیداری جو چلتے چلتے پورے ملک کی بیداری بن گئی۔ عوام کو بیداری ہم نے دی۔ ہم نے انسانوں کا لہو دیکر ایسا کیا۔ ہم نے اس بیداری کے لیے اپنے گھر کو قربان کیا۔ اپنی بیٹیوں کی عصمت کے تدرانے دیئے۔ پھر بھی بیداری نہ آتی۔ آپ لوگ تو پانچ سال تک دفعہ ۱۴۴ کے نیچے دبے بیٹھے رہے۔ سینگینیوں کو ہم نے اپنے سینوں سے روکا۔ ہمارا لہو، بلوچستان کا لہو، بیداری بنا۔ نعرہ بنا۔ بھٹو کیا بیداری دے گا۔ کوئی بھی جاگیردار کبھی بیداری نہیں دے سکتا۔ جاگیردار کبھی عوام میں نہیں آئے گا۔''

''لیکن کیا بھٹو کی گرفتاری سے اس کے دورِ حکومت کے مظالم کا ازالہ نہیں ہوگا۔''

شیر محمد مری نے اپنی آنکھ کے زخم سے اٹھنے والی تکلیف کا تذکرہ کیا اور کہا کہ میں علاج کے لیے باہر جانا چاہتا ہوں، لیکن میرا پاسپورٹ ضبط ہے۔ ہمارے ملک میں اس کا علاج

Scanned with CamScanner

نہیں۔ آپ خود دیکھیں میری ایک آنکھ بند ہے۔ انصاف تو آج بھی نہیں۔ آنکھ کا مسئلہ تو سیاست نہیں۔ میں بلوچستان میں ایک اعلیٰ افسر کے پاس گیا اور کہا کہ میں باہر جانا چاہتا ہوں۔ مجھے پاسپورٹ واپس دیجئے۔ یہ شخص بھٹو کے دور کے تمام مظالم میں شریک تھا اور آج بھی ڈھٹائی کے ساتھ خود کو حکمران سمجھ رہا ہے۔ خدا معلوم جنرل ضیاء کو اس کی حرکتوں کی خبر ہے کہ نہیں۔ اس نے مجھے جواب دیا کہ آپ پاسپورٹ کی بات کرتے ہیں۔ ہم آپ کو بہت جلد پاسپورٹ کی زحمت سے ہی نجات دلوادیں گے۔ میں نے اس کو جواب دیا کہ شیر محمد مری کو مارنا اتنی آسان بات نہیں۔ یہ بلوچستان ہے مشرقی پاکستان یا انڈونیشیا نہیں۔ اگر تم نے مجھے مارا۔ تو بلوچ کہے گا کہ ایک بلوچ کم ہوگیا۔ اسی طرح اگر کسی نے تم کو مارا۔ تو کراچی والے کہیں گے کہ ہمارا ایک شہری کم ہوگیا۔ بھٹو نے یہ سب کچھ کرکے دیکھ لیا ہے۔!!

"مسئلہ کسی شخص کو گرفتار کرنے سے حل نہیں ہوتا۔ صرف ایک فرد مجرم نہیں ہوتا بلکہ اس کے کئی ہاتھ اور پاؤں ہوتے ہیں۔ ان کو بھی توڑنا چاہیئے ان کو بھی موڑنا چاہیئے۔ بھٹو ہی بدمعاش تھا تو آج بھٹو کے ساتھ بے روزگاری کیوں ختم نہیں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ فرد کچھ نہیں۔ فرد کی کچھ خامیاں ہوتی ہیں لیکن سارا جبر ریاستی ہوتا ہے۔ فرد زیادہ مجرم نہیں ہوتا۔ ہمیں فرد کو نشانہ بنانا نہیں چاہیئے۔ ہم ظلم کی جڑ کو اکھاڑنا چاہتے ہیں۔ بھٹو کا فکر بھی ریاستی تھا۔ اسی لیے اس نے گولیاں چلائیں۔ تشدد کیا، لیکن اسے کیا حاصل ہوا۔ آخر اسے جانا پڑا!!! بھٹو کیوں گیا؟ بھائی یہ ایک کھیل ہے۔ یہ فٹ بال کا کھیل ہے۔ ریفری وہی ہے جو رہتا ہے۔ باکس آفس پر اس کا قبضہ ہے تماشائی عوام ہیں بلکہ المیہ یہ ہے کہ ہم نہ صرف تماشائی ہمیں بلکہ تماشبین بھی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آج بھٹو جیل میں ہے، لیکن دراصل اسے ریکنڈیشن کیا جارہا ہے۔ اگر سب ناکام ہوگئے تو پھر بھٹو کو ہی لایا جائے گا۔ سامراج ہمیشہ متبادل کا متبادل رکھتا ہے۔ سامراج بہت حرامی ہوتا ہے۔"

"شیر محمد مری صاحب! کیا آپ صحافیوں کی حالیہ تحریک اور آزادی صحافت کے بارے میں کچھ کہنا چاہیں گے۔ آپ کے میزبان معراج محمد خاں تو آزادی صحافت کے مسئلہ پر خاصے گرج رہے ہیں اور موجودہ تحریک کے لیے کوشاں ہیں جبکہ ماضی میں اس کے لیے جدوجہد کرنے والے اس تحریک کو بھٹو کے حامیوں کا شور قرار دے رہے ہیں"

"میں کہتا ہوں کہ اس ملک کی تباہی کے ذمہ دار ترقی پسند حضرات اور صحافی ہیں۔ جس

طرح انہوں نے قلم کے سر قلم کیے ہیں، میرا جی چاہتا ہے کہ میں بھی ان کے سر قلم کر دوں۔ دیکھنا! مجھے صحافیوں سے لڑوا نہ دینا۔ اس لیے کہ ہمارے ملک میں سچی بات کو سننے کا حوصلہ بہت کم ہے اور خصوصاً بلوچ کی تو کوئی بات نہیں سنی جاتی۔ آپ لوگ آزادی صحافت کی بات کرتے ہیں۔ آپ لوگ صحافی کہاں ہیں! آپ لوگ تو منشی ہیں، آپ کی آزادیٔ صحافت تو پہلی تاریخ ہے اور آپ جس قسم کی آزادی صحافت چاہتے ہیں۔ اس کے لیے یہاں یورپ جیسا صنعتی ماحول کہاں ہے۔ یہاں تو جمہوریت بھی نہیں۔ آپ لوگوں کی حالیہ تحریک ''صحافی اولمپک فٹ بال میچ ہے، آپ کی تحریک محدود ہے۔ آپ کے مطالبے محدود ہیں۔ آپ مزدوروں اور کسانوں کے مسائل کی بات نہیں کرتے۔ آپ اپنی گیم کھیل رہے ہیں۔ جب آپ کے پیٹ پر جوتا پڑا تو آپ سڑکوں پر آ گئے۔ بلوچستان میں جو کچھ ہوا، اس کے خلاف کتنے صحافی میدان میں آئے۔ یہ کسان تو بیچارے شریف لوگ ہیں، جو آپ کے ساتھ آ گئے۔ اگر آپ کل استحصال کرنے والوں پر اپنے قلم کے کوڑے مارتے تو آج آپ کا یہ حشر نہ ہوتا، لیکن آپ نے اپنے فرض سے غفلت برتی۔ مجھے خوشی ہے کہ جب ان کی باری آئی تو انہوں نے آپ کی ننگی پیٹھ پر کوڑے برسائے، انہوں نے اپنا فرض ادا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں برتی۔ آج بھی آپ دیکھیے۔ کیا ہو رہا ہے؟ ہماری صحافت کہاں جا رہی ہے! خود سرکاری صحافیوں کا کردار آپ کے ساتھ کیسا ہے، ہمارے یہاں ہر فکر آوارہ گرد ہے۔''

میں نے پوچھا! ''بلوچستان میں عام معافی کا بھی کچھ اثر ہوا یا نہیں؟''

کہنے لگے! عام معافی بھٹو بھی کئی مرتبہ دے چکا ہے۔ یہ بھٹو سے مستعار لیا ہوا طریقہ ہے فاتح ہمیشہ مفتوح کو معافی دیتا ہے۔ میں یہ بتاؤں کہ ہم کبھی مفتوح نہیں رہے۔ یہ معافی کس کو دی گئی ہے۔ ایک لاکھ تیس ہزار لٹے ہوئے انسانوں کو، جھلسی ہوئی زمین کو۔ یہ معافی کس کو دی گئی ہے۔ یہ معافی قاتل کو دی جا رہی ہے یا مقتول کو۔ یہ معافی ڈاکو کو دی جا رہی ہے یا لٹنے والے کو۔!! یہ معافی کس کو دی جا رہی ہے۔ عام معافی کے نتیجے میں بہت سارے لوگ واپس نہیں آئے۔ وہ پہاڑوں پر ہیں۔ بلوچستان میں کوئی خاص تبدیلی آئی؟ فرضی اعداد و شمار ہیں جو پیش کیے جا رہے ہیں۔ چاہے وہ ترقیات کے بارے میں ہوں۔ یا حالات سدھرنے کے بارے میں!!! ایک سال گزرنے کے بعد بھی بلوچ عوام کو قانونی اسلحہ اور لائسنس واپس نہیں کیے جا رہے جس کی ایک مثال میں آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔ بے شمار افراد ابھی لاپتہ ہیں۔ وہ

مختلف کیمپوں میں ہیں یا جیلوں میں، پتہ نہیں جنرل صاحب کو اس بات کا علم ہے کہ نہیں! بلوچستان میں ایرانی اسلحہ تقسیم ہو رہا ہے، جرائم پیشہ افراد کو سرکاری معاون بنایا جا رہا ہے۔ شہری اور آئینی حقوق ملنے چاہئیں، یہی باعزت معافی ہے۔''

ہم نے پوچھا:

''مری صاحب ترقی پسند یعنی لیفٹ میں اتحاد ہونے کے کتنے امکانات ہیں اور کیا آپ بھی اسی گروپ کی نمائندگی کرتے ہیں۔''

شیر محمد مری نے جواب دیا۔

''سرخ جھنڈا سرخ جھنڈے کو بلند کرنے کے لیے نہیں اٹھایا جاتا۔ اب سامراج ہوشیار ہو گیا ہے۔ اب سرخ جھنڈا سرخ جھنڈے کو سرنگوں کرنے کے لیے اٹھایا جاتا ہے۔ میں لیفٹ کو اتنی آسانی سے لفٹ دینے کے لیے تیار نہیں۔ تیس برس ہمارے سامنے ہیں۔ انہوں نے کیا کیا ہے؟ آپ کی لیفٹ سے مراد کیا ہے؟ رائٹ کا لیفٹ یا لیفٹ کا رائٹ۔''

ہم نے وضاحت کی کہ وہ لوگ جو طبقاتی جدوجہد کے ذریعے معاشرے کو استحصال سے پاک کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

انہوں نے کہا میں کوئی نجومی تو نہیں! جو ان کے دل میں جھانک کر یہ اندازہ لگا سکوں کہ وہ کتنا صحیح کہتے ہیں! اگر واقعی ملک میں لیفٹ موجود ہے تو اس میں اتحاد کیوں نہیں ہوتا ہے وہ ایک نکتے پر یقین رکھتے ہیں تو یقیناً! ان میں اتحاد ہونا چاہیئے۔ اتحاد کیوں نہیں ہوتا؟ یقیناً! کہیں تو سگنل خراب ہے جو ٹریفک رکی ہوئی ہے۔ اگر واقعی کہیں لیفٹ ہے تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ میں تعاون کے لیے حاضر ہوں۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ ہر وہ گروہ اور فکر جو قومیتوں کے حقوق کی حفاظت کرے گی اور سامراجیوں سے لڑے گی۔ میں ان سے غیر مشروط طور پر اتحاد کے لیے تیار ہوں بلکہ ہمارا خود بخود ان سے اتحاد ہو جائے گا۔ ہم ہر ایک کو دعوت دیتے ہیں کہ یا تو آپ ہماری جدوجہد میں شامل ہو جائیں یا آپ بھی اپنی مدد کے لیے پکاریں۔ نیشنل عوامی پارٹی ہمیں انقلابی نظر آئی۔ بھاشانی کو ہم نے مارکس سمجھا۔ بھٹو ہمیں لینن دکھائی دیے۔ ہم احمق نہیں تو پھر کیا ہیں۔ عوام کو کس نے بتایا کہ یہ لوگ انقلابی ہیں۔ اب ہم اپنے گناہ دوسروں کے سر تھوپنا چاہتے ہیں۔

''شیر محمد مری صاحب! آپ نے گذشتہ دنوں ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ ہر غیرت مند

Scanned with CamScanner

بلوچ مسلمان کو اپنے سینے پر لینن کا بیج لگانا چاہیے، کیا یہ بات صحیح ہے؟''

''بالکل صحیح ہے۔ میں آج بھی یہ کہتا ہوں کہ ہر غیرت مند مسلمان بلوچ کو اپنی عظمت میں اضافے کے لیے ان کا بیج لگانا چاہیے۔ ایک بار ''نوائے وقت'' نے میرے اس خیال کے خلاف اداریہ بھی لکھا۔ میری اس بات پر اس نے اعتراض کا طوفان اٹھایا، لیکن جب بلوچوں کے سینوں پر گولیاں چل رہی تھیں تو یہی اخبار اور اس کے اداریہ نویس خاموش تھے۔ اس وقت بھی کچھ لکھتے۔ آپ لینن کی کتابیں ضبط کرتے ہیں۔ اس کی کتابیں پڑھنے والوں کو جیل میں ڈالتے ہیں۔ اس کے بیج پر پابندی لگاتے ہیں، لیکن وہی لینن آپ کے سامنے روبلز کے روپ میں آتا ہے تو آپ اسے سجدہ کرتے ہیں۔ آپ ان سے فولاد کے کارخانے لگواتے ہیں۔ ہم لینن کی کتاب پڑھیں تو جُرم اور پروفیسر غفور احمد چوری چوری روسی سفیر سے ملاقات کریں تو عین اسلام۔ واہ، خوب ہے آپ لوگوں کا انصاف......!''

''مری صاحب! ایک پاکستانی کی حیثیت سے آپ ایٹمی ری پروسیسنگ پلانٹ پر بھی اپنی رائے ظاہر کریں گے؟ آج کل یہ موضوع خاصا زیرِ بحث آتا جا رہا ہے............!

''خدا معلوم کہ معاہدہ ہوا بھی ہے یا نہیں۔ کِس نے دستخط کیے ہیں۔ فرانس کی جانب سے کون تھا، پاکستان کی جانب سے کس نے دستخط کیے، کیا شقیں تھیں۔ ری پروسیسنگ پلانٹ ہماری زندگی یا موت کا مسئلہ نہیں۔ مسئلہ غریبوں کی روٹی کی فراہمی کا ہے۔ آپ صاف کیوں نہیں کہتے کہ آپ ایٹم بم بنانا چاہتے ہیں لیکن آپ یہ کس پر گرائیں گے۔ کیا آپ ایٹم بم بنا کر پلٹن میدان میں اپنی عریانیت پر پردہ ڈالنے کی تو کوشش نہیں کر رہے۔ آپ ایمانداری کی بات کیوں نہیں کرتے۔ پہلے بھوک کے ایٹم بم پر تو قابو پالیجیے۔ پہلے روٹی بنانے کا ری پروسیسنگ پلانٹ تو لگا لیجیے۔ میں دفاعی قوتوں میں اضافے کا مخالف نہیں، لیکن پہلے عوام کے دکھ تو دیکھ لیجیے۔ آپ چاہتے ہیں کہ ری پروسیسنگ پلانٹ لگایا جائے، لیکن امریکہ روکتا ہے۔ امریکہ کون ہوتا ہے روکنے والا۔ آپ خود روکتے ہیں اپنے آپ کو۔''

ہم نے سوال کیا ''وہ کیسے''؟

انہوں نے کہا:

''بھکاریوں کو جو ٹکڑا ملے وہ کھانا چاہیئے۔ بھکاری کبھی [illegible] نہیں بن سکتا۔ اس کو آپ کی غلامانہ حماقتوں پر اعتراض ہے۔ آپ خود کفیل ہو جائیں، کسی [illegible] نہ مانگیں، پھر آپ کو [illegible]

نہیں روکے گا۔ بھائی بھکاریوں کو تو کوئی بھی بدمستی نہیں کرنے دیتا۔ آپ ایٹم بم بنانے سے پہلے غلامی کا طوق اپنے گلے سے اتاریے۔ پھر جو چاہے کیجئے۔''

''کچھ ایران کی سیاسی بیداری کے بارے میں بھی فرمائیں گے؟''

''ایران کثیر القومیت ملک ہے۔ وہاں ملوکیت ہے۔ مظلوم طبقات بھی جو ہر جگہ موجود ہوتے ہیں، لہذا صدیوں کے بعد وہاں کے پسے ہوئے طبقات اور مظلوم قومیت نے اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کی ہے اور سامراج طاقت کے بل بوتے پر بڑی بے رحمی سے اسے دبانے کی کوشش کر رہا ہے۔ آج کا ایران ایک انقلابی بحران کا شکار ہے جسے افغانستان کے عوامی انقلاب نے مکمل شہ دی ہے، لیکن سامراج اور وہاں کی ملوکیت اسے صحیح راہ سے ہٹانے کے لیے کچھ انقلابی تبدیلیوں کی کوشش کر رہی ہے۔ سامراج اپنے ذیلی سامراج کو بچانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہے۔ لیکن اس کا حشر بھی ویت نام اور کمبوڈیا جیسا ہوگا۔''

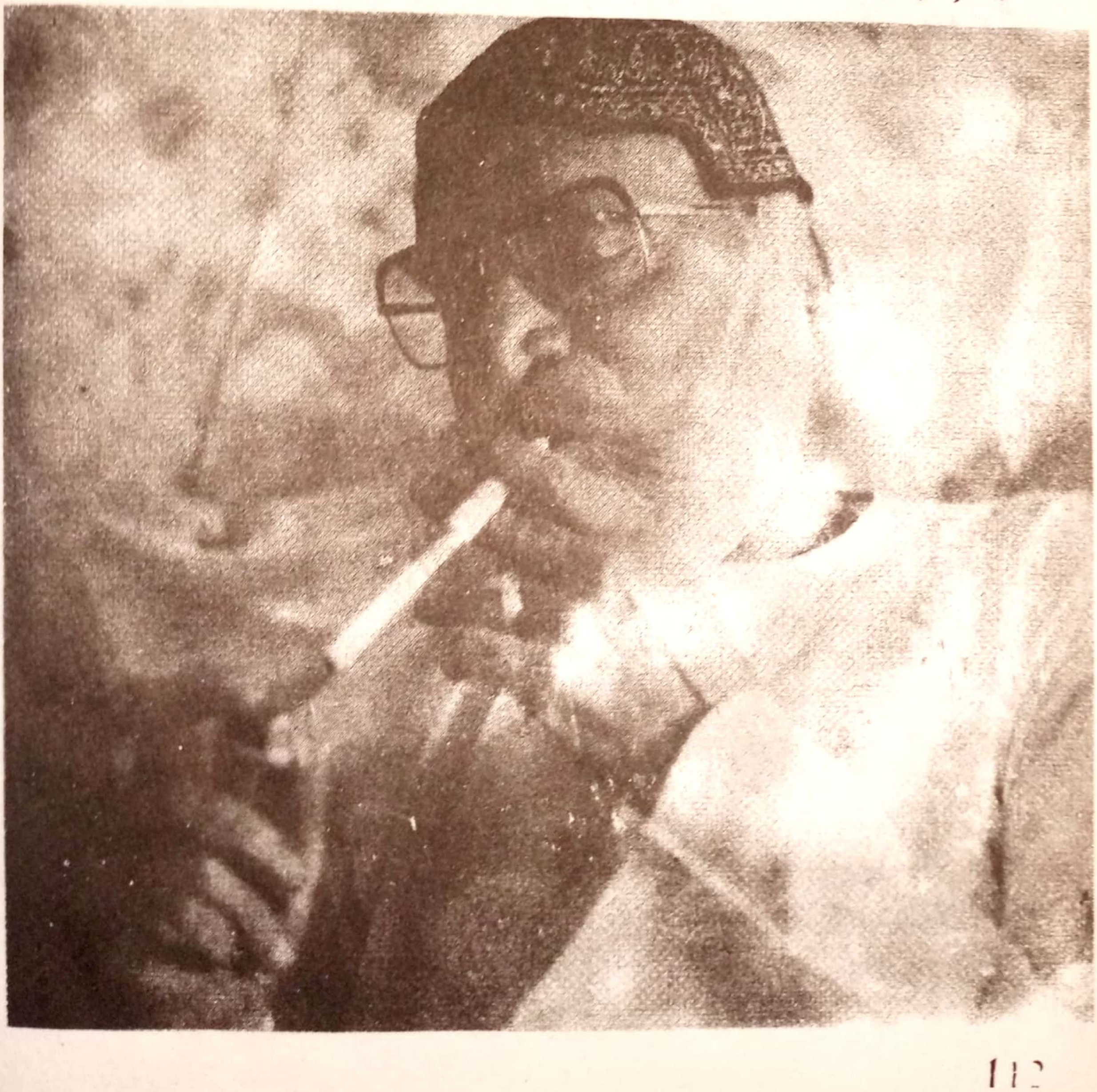

Scanned with CamScanner

فوج ہی وفاق کی علامت ہے

انٹرویو: عامر ضیاء

سوال: آپ نے یہ ملک کیوں اور کس قسم کے حالات کے تحت چھوڑا تھا؟

مری: اس وقت دراصل وہ حالات بتانے کا درست موقع نہیں ہے۔ میں نے 12 جولائی 1980ء کو یہ ملک چھوڑا تھا۔ اس سے پہلے میں دو سال اپنے ہی گھر میں نظر بند رہا اور مجھے وہیں ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ ہارٹ اٹیک کے بعد جو ایک میڈیکل بورڈ میری تشخیص کیلئے بٹھایا گیا جس نے مجھے علاج کے لئے باہر بھجوانے کا مشورہ دیا۔ لیکن اس کے باوجود مجھے ایک سال تک پاسپورٹ حاصل نہیں ہوسکا۔ جب حکومت نے مجھے جانے کی اجازت دی تو سب سے پہلے میں لندن گیا اور وہاں پانچ مہینے تک قیام کیا، اس کے بعد میں کابل گیا اور سارا عرصہ وہیں گذارا۔

سوال: کن معاملات نے آپ کو ملک میں آنے سے روکے رکھا؟

مری: بھئی اس معاملہ پر گفتگو کرنے کا ابھی وقت نہیں آیا ہے۔

سوال: بحیثیت ایک سیاست دان کے آپ اتنا لمبا عرصہ پاکستانی سیاست سے باہر گزارنے کے بعد کیا محسوس کرتے ہیں۔ یعنی آپ نے کچھ کھویا ہے یا پایا ہے؟

مری: پاکستانی سیاست سے خاصا عرصہ باہر رہنے کے باوجود مجھے زیادہ نقصان نہیں ہوا ہے۔ میں نے اس لمبے عرصے کے دوران خاصا کچھ گنوایا بھی ہے اور بہت کچھ حاصل بھی کیا ہے۔ لیکن یہ درست ہے کہ میں بہت چیزوں سے محروم رہا ہوں۔

سوال: کیا اس عرصہ قیام کے دوران آپ کی زندگی میں کچھ نئے اضافے ہوئے؟

مری: میں نے اپنی زندگی میں جتنی بھی چند چیدہ کتب پڑھی ہیں ان میں میرے نزدیک سب سے اہم کتاب افغانستان کے حالات کا مطالعہ ہے۔ جب میں وہاں مقیم تھا تو میں نے

اس کتاب کو دن میں بھی پڑھا اور رات کو بھی مطالعہ کیا۔ افغانستان وہ جگہ ہے جہاں سے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں اور بہت عمدہ سبق بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

سوال: آپ کی یہ خود ساختہ جلاوطنی کس وجہ سے اختتام کو پہنچی؟ کیا وطن پارٹی کا خاتمہ بڑا سبب ہے یا کوئی اور وجوہات ہیں؟

مری: دراصل بات یہ ہے کہ اب میں افغانستان میں مزید قیام نہیں کر سکتا تھا کیونکہ جیسے ہی اسلامی حکومت تشکیل میں آئی، وحدت اسلامی کے مسلح دوستوں نے (جن کی پشت پناہی ایران کر رہا تھا) میرے مکان کو گھیرے میں لے لیا۔ انہوں نے میرے چاروں محافظوں سے ہتھیار چھین لئے، ہمیں الٹی میٹم دیا کہ صرف آدھے گھنٹے میں یہ مکان چھوڑ کر یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔ میں نے ان مخبوط الحواس لوگوں سے کہا کہ میں کس طرح اتنے مختصر وقت میں اپنے خاندان کے ساتھ کہیں اور شفٹ ہو سکتا ہوں، لیکن وہ مسلسل اسی انداز میں ہمیں پریشان کرتے رہے اور ہمیں مجبور کر دیا کہ ہم وہ جگہ چھوڑ دیں۔

جس دن میں افغانستان چھوڑنے کا منصوبہ بنا رہا تھا تو اسی دن ایک افغان وزیر مولوی یونس خالصی نے مجھے فون کیا اور میری خیریت دریافت کی۔ ان کے علاوہ ایک اور مقامی کمانڈر نے مجھ سے رابطہ کیا۔ میں نے ان دونوں سے گذارش کی کہ مجھے بمعہ اہل خاندان اگر با حفاظت ایئرپورٹ بھجوا دیا جائے تو میں آپ کا شکر گذار رہوں گا۔ یوں چند گھنٹے بعد پاکستانی سفارت خانہ کے سیکریٹری آں پہنچے اور انہوں نے اپنی کار میں ہمیں با حفاظت ایئرپورٹ پہنچا دیا۔

سوال: ماضی میں آپ کا تعلق بائیں بازو کی مسلح جماعتوں سے تھا، کیا اب بھی آپ اپنے نظریات پر یقین رکھتے ہیں؟

مری: جناب! میرے نظریات ویسے کے ویسے ہیں اور ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آئی ہے، بلکہ درحقیقت جب سے میں نے پوری دنیا گھومی اور دیکھی ہے وہ زیادہ حقیقی صورت میں نمایاں ہو چکے ہیں۔ میں نے کئی حکومتوں کو ابھرتے ہوئے اور ڈوبتے ہوئے دیکھا ہے۔ دانشوروں کو انقلاب لاتے ہوئے بھی دیکھا ہے اور اُنہیں کامیابی سے چلاتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ دراصل ان تمام وجوہات سے میرے نظریات کو تقویت پہنچی ہے اور وہ زیادہ مضبوطی سے قائم ہیں۔

سوال: آپ کے خیال میں کیا مارکس ازم کا نظریہ ناکام ہو چکا ہے؟

مری: بالکل نہیں۔ وہ اب بھی اسی طرح زندہ ہے۔ دراصل صرف روس کی حکومت کا نظریہ سوشلزم ناکام ہوا ہے۔ میں نے بہت سے مشرقی یورپ کے ممالک اور خصوصاً ماسکو کا کئی بار دورہ کیا ہے اور میں نے محسوس کیا ہے کہ وہاں سوشلزم اپنی اصلی بنیادوں پر موجود نہیں تھا۔

وہاں کارل مارکس، اینجلز اور لینن کی تعلیمات پر عمل نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ خودساختہ نظریات پیدا کر لئے گئے تھے۔ اسی لئے مارکس ازم اب بھی کسی حد تک زندہ ہے۔ یہ ایک نظریہ ہے جس میں تھیوری اور عمل دونوں کے تصورات پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔ سوشلزم درحقیقت صرف روس کی ہی ملکیت نہ تھا، وہ پوری دنیا کے عوام کا نظریہ ہے۔ اگر وہ وہاں کامیاب نہیں ہو سکا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کا مکمل طور پر خاتمہ ہو چکا ہے۔

سوال: پاکستان میں کئی بائیں بازو والی اور قوم پرست جماعتیں سرگرم عمل ہیں۔ ان کے بارے میں آپ کے کیا تنقیدانہ خیالات ہیں؟

مری: دراصل پاکستان کے قوم پرستوں کے ساتھ بڑا مسئلہ یہ ہے کہ جب وہ اپنے حقوق کی بات کرتے ہیں تو فاشسٹوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف کمیونسٹ صرف ٹریڈ یونینوں سے ہی منسلک رہے ہیں۔ دونوں ایک ایسی حکمت عملی تیار کرنے میں بالکل ناکام ہو چکے ہیں جو ان کے معاشرتی و معاشی مسائل کے مطابق ہو۔ اور اسی لئے وہ اپنی منزل مقصود سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ اس ملک میں معاشرتی طور پر انقلاب لانے کیلئے معاشی و معاشرتی رویہ میں بیلنس برقرار رکھنا نہایت ضروری ہے۔

میرا خیال ہے کہ پاکستان میں اس قسم کی سیاست ارادتاً پیدا نہیں ہونے دی جاتی کیونکہ زیادہ تر قوم پرست رہنما اور بائیں بازو کے رہنما خودساختہ لیڈر ہیں اور ان کا تعلق ''چوروں'' کی جماعت سے ہے۔ جی ہاں! ہمارے ہاں ایسے سوشلسٹ اور قوم پرست رہنما بھی پائے جاتے ہیں جن کا تعلق پاکستان کے جاگیرداری طبقے سے ہے اور وہ عوام کی خواہشات کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔

سوال: کن حالات نے آپ کو ایک سیاسی جماعت بنانے سے روکے رکھا تا کہ آپ اپنے

Scanned with CamScanner

نظریات کو عام کرتے؟

مری: بھئی اس سوال کا حقیقی جواب یہ ہے کہ پاکستان میں ایسی کوئی جماعت موجود نہیں ہے جسے حقیقتاً سیاسی جماعت کہا جا سکے۔ ہمارے یہاں جس سیاست کا وجود ہے وہ "بردہ فروشی" کہلائی جا سکتی ہے۔ یہاں ضمیر بکاؤ مال ہے اور روحوں کا سودا کیا جاتا ہے۔

ایک ہی قسم کے لوگ متفرق ناموں کا خول چڑھا کر پچھلے کئی سالوں سے سیاست پر گدھوں کی طرح چمٹے ہوئے ہیں۔ یہ سب پرانے شکاری ہیں جو نت نئے جالوں کے ساتھ عوام کا شکار کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ اور نت نئے پُر فریب نعروں سے انہیں بہکاتے رہتے ہیں۔ میں اس قسم کی سیاست کے بالکل برخلاف ہوں۔

ایک حقیقی سیاسی جماعت کو پیدا کرنا کوئی مذاق یا کھیل نہیں ہے اور ابھی پاکستان کے لوگوں میں ایسی جماعت کو تشکیل دینے کا شعور پیدا نہیں ہوا ہے۔ یہاں تو یہ ہوتا ہے کہ ایک خاص طبقے کے حامی پچیس آدمی اکٹھے ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ کو ایک سیاسی جماعت قرار دے ڈالتے ہیں۔ ظاہر ہے ہر باشعور شخص ان بیکار و فضول باتوں پر کان نہیں دھرے گا۔

سوال: آپ کو وفاق سے کس قسم کی شکایات ہیں؟

مری: یہاں وفاق کہاں ہے بھائی؟ اس ملک پر تو اسلام آباد حکومت کرتا ہے اور وہی مرکزی قوت بھی ہے۔ فوج ہی وفاق کی علامت ہے اور درحقیقت اب تک لمبے فوجی بوٹ ہی ملک پر حکمرانی کرتے چلے آئے ہیں۔ اس ملک میں کبھی بھی جمہوریت اپنی اصلی شکل میں نہیں آئی ہے اور فوج ہی کو سپریم قوت حاصل ہے۔ عموماً وہ ہر وقت اس کوشش میں مصروف رہتی ہے کہ جلد از جلد منتخب سیاسی حکومت کو کک آؤٹ کر سکے یا ایک سیل (Exile) کر سکے۔ یہاں عرصے سے چھوٹے صوبوں کو ان کے جائز حقوق سے محروم رکھا جا رہا ہے۔ اس قسم کے حالات تب ہی سے ہیں جب سے ملک وجود میں آیا ہے۔

اب بلوچستان ہی کی مثال لیں۔ یہاں ہر قسم کے معدنیات موجود ہیں اور ہر قسم کے قدرتی خزانے پائے جاتے ہیں۔ یہاں سونے سے لیکر لوہے تک کے ذخائر موجود ہیں۔ یہاں فلورائیڈ جیسی قیمتی عنصر اور کرومائٹ اور یورینیم تک پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود بلوچستان کے لوگوں کو ان کے جائز حقوق سے بھی نوازا نہیں

Scanned with CamScanner

گیا ہے۔

سوال: کیا آپ اپنے پرانے ساتھیوں خیر بخش مری، عطاء اللہ مینگل اور نواب اکبر بگٹی کے ساتھ مل کر کوئی نیا اتحاد تشکیل دیں گے؟

مری: بات یہ ہے کہ اب حالات مکمل طور پر بدل چکے ہیں۔ لہذا اس وقت کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔ بلوچستان کی سیاست میں بھی خاصی تبدیلیاں ظہور پذیر ہوچکی ہیں۔ خصوصاً سیاست جو وراثت کی بنیادوں پر کی جاتی تھی، اب اس کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اب پُرانی سوچوں والے کہیں بھی کھڑے ہو کر مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں۔

سوال: آپ یہ بتائیے کہ نیپ کے پشتون عنصر نے جدوجہد میں حصہ کیوں نہیں لیا تھا؟

مری: یہ بات بالکل درست ہے کہ نیپ بھی درحقیقت جاگیرداروں اور سرداروں کی جماعت ہے۔ جب بھی بلوچ کسی معاملہ پر صف بندی کرتے تھے تو عموماً پشتون خاموش رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔ اس بات کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ سابقہ لڑائیوں میں پشتون علاقوں سے ایک بلٹ بھی فائر نہیں کیا گیا تھا۔

سوال: 1970ء کے عشرے میں بائیں بازو کی زیادہ تر جماعتیں بھٹو کے ساتھ مل گئی تھیں، آپ کے خیال میں یہ اقدام درست تھا؟

مری: اس زمانے میں جن بائیں بازو والی جماعتوں نے بھٹو کا ساتھ دیا تھا انہوں نے نہایت فاش غلطی کی تھی۔ وہ بھٹو کے پرفریب اور جعلی سوشلسٹ نعروں پر جان دینے لگے جو ایک سراب کے علاوہ کچھ نہیں تھے۔ اس زمانے میں بائیں بازو کی سب جماعتیں مبالغہ آرائی میں مصروف ہوگئیں تھیں جو ان کی بہت بڑی غلطی تھی اور اب وہ سب اس زمانے میں اپنے کیے ہوئے دعوے کا انجام بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اب انہیں اس بات کا احساس ہوگیا ہوگا کہ بھٹو جس قسم کی کلاس سے تعلق رکھتا تھا جو عوام پر بُری طرح مسلط رہا ہے اور ان کا خون چوس رہا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اس مخصوص کلاس سے تعلق رکھنے والوں کے کردار کو راتوں رات تبدیل نہیں کیا جاسکتا ہے۔

سوال: اس وقت جو پاکستان میں سیاست کی مجموعی صورت حال ہے، کیا آپ اس سے مطمئن ہیں اور بلوچستان میں کس قسم کی سیاست ہو رہی ہے؟

مری: بات یہ ہے کہ بہ حیثیت مجموعی اس وقت پاکستان کے حکمران اپنے ماضی کی روایات کو

برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اب بھی چھوٹے صوبوں کو ان کے جائز حقوق سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے پچھلے چند برسوں میں خاصے قوم پرست رہنما ابھر کر سامنے آئے ہیں اور ان کی سرگرمیاں تیز سے تیز تر ہوتی چلی جارہی ہیں۔ اس وقت قوم پرست آزادی کی تحریکوں نے پوری دنیا کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے اور حالیہ تبدیلیاں ناقابل تردید ثبوت پیش کرنے میں مصروف ہیں۔ اگر تاجکستان ایک آزاد مملکت کا روپ اختیار کرسکتا ہے تو دوسری مظلوم اقوام آزادی کا جامہ کیوں نہیں پہن سکتی ہیں۔ دراصل پنجاب اب تک اپنے ان تصورات کو محو نہیں کررہا ہے کہ "ایک قومی نظریہ" بالکل غلط ہے۔ اور اب اس نظریہ کو تاریخ نے بھی غلط ثابت کردیا ہے۔ ان کے لئے تاریخ محض اعداد و شمار کا کھیل ہے۔

ایک زمانہ تھا جب ملک کی بنیاد مذہب کے نام پر رکھی گئی تھی اور اسے مسلمان قومیت کا نام دیا گیا تھا۔ ہم نے اس وقت ایسے نظریئے کی پرزور مخالفت کی تھی۔ تاریخی حقائق یہ بتاتے ہیں کہ عام طور پر ایک قوم تھوڑے ہی عرصے کے بعد رنگا رنگ قوموں میں تقسیم ہوجاتی ہے۔ اس لئے آپ دیکھ رہے ہیں کہ مہاجر قومیت کا نعرہ بھی بن رہا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اب مسلم قومیت کا نعرہ کہاں ہے؟ ہمارے نظریات کو وقت نے ثابت کردکھایا ہے۔

سوال: بلوچستان میں فرقہ پرستی کے اثرات خصوصاً ذکریوں کے خلاف اثرات سر اٹھا رہے ہیں، اس مسئلے کے بارے میں آپ کے تاثرات کیا ہیں؟

مری: میں سب لوگوں خصوصاً ملاؤں کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ بلوچستان کبھی بھی ایک اور جھنگ میں تبدیل نہیں ہوسکتا۔ اگر ملاؤں نے ہمارے ساتھ کسی قسم کا کھیل کھیلنے کی کوشش کی تو انہیں اس کی بہت بھاری قیمت چکانی پڑے گی۔ وہ اپنے بیہودہ اور لچر مسائل کے ذریعے کبھی بھی بلوچوں کے درمیاں نفاق پیدا نہیں کرسکتے ہیں۔

میں اپنے تمام دوستوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ملاؤں کے بچھائے ہوئے اس سازش کے جال کی نہایت سختی سے مخالفت کریں اور اسے کاٹ ڈالیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کسی کو غیر مسلم قرار دینے والے کون ہوتے ہیں؟ وہ کیوں کر خدا برتر کی لامحدود طاقتوں کو اختیار کرسکتے ہیں؟ یہ سب ملا پہلے ہی قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دے

Scanned with CamScanner

چکے ہیں اور اب یہ ذکریوں کو بھی اسلام کے دائرے سے خارج کر دینا چاہتے ہیں اور اس کے بعد یہ خوجہ برادری کے خلاف اٹھ کھڑے ہو جائیں گے اور اس کے بعد بوہری وغیرہ ان کا نشانہ ہوں گے۔ آخر کار آپ دیکھیں گے کہ یہ سارے آپس میں دست بدست جنگ میں مصروف ہو جائیں گے اور ایک دوسرے کو" کافر" قرار دینا شروع کر دیں گے۔ جو ملا ذکریوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں انہیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ذکری بلوچ قوم سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ ملا انہیں کبھی بھی نہیں کچل سکتے ہیں۔ اگر انہیں کچلنے کیلئے ہاتھ بڑھے تو پوری بلوچ قوم متحد ہو کر کھڑی ہو جائے گی اور اس ہاتھ کو کاٹ دیا جائے گا۔

سوال: اس وقت پشتون اور بلوچ طبقات میں خاصی مخالفت پائی جاتی ہے، اس کے بارے میں اپ کچھ کہنا چاہیں گے؟

مری: بات یہ ہے کہ حقیقتاً مجھے اس مسئلے کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں۔ بلوچوں اور پشتون کے درمیان کئی صدیوں سے مستحکم تعلقات چلے آ رہے ہیں اور اس وقت صرف وہی قوتیں ان کے درمیان نفرت کا اضافہ کر رہی ہیں جو اپنے ذاتی مقاصد حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ اگر یہ مسئلہ بڑھتا چلا گیا تو یقیناً آخر میں تقسیم کی راہ پر گامزن ہو جائے گا۔ میں متحدہ بلوچستان کے حق میں ہوں اور اس کے خلاف ہر قسم کی سازش کی مخالفت کرتا ہوں۔ میں اگرچہ قوم پرست ضرور ہوں لیکن میرے خیالات اور نظریات فاشسٹوں کے جیسے نہیں ہیں۔ میں اپنے لوگوں کو جائز حقوق دلوانے کا خواہش مند ہوں اور اسی طرح تمام قوموں کے جائز حقوق کا بھی دلی احترام کرتا ہوں۔

سوال: آپ کے خیال میں پاکستان میں وہ کونسا عنصر ہے جو جمہوریت کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتا رہتا ہے؟

مری: اس سوال کا جواب ایک ناخواندہ شخص بھی دے سکتا ہے۔ یقیناً فوج ہی جمہوریت کی راہ میں اصل رکاوٹ ہے۔ درحقیقت پاکستانی سیاست کے پیچھے ہمیشہ فوج کا ہی ہاتھ کام کر رہا ہے اور اسی ادارے سے تعلق رکھنے والے افراد پاکستان میں تمام تر تبدیلیوں کے ذمہ دار ہیں۔ اس ملک میں جمہوریت اپنی اصل روح میں کبھی بھی منظر عام پر نہیں آئی ہے۔ پاکستان کے یہ آقا چاہتے ہیں کہ پاکستان میں جمہوریت کا لفظ عنقا ہو جانا چاہئے اور حتی

کہ لولی لنگڑی جمہوریت بھی یہاں نہیں قائم ہونی چاہئے۔

اسی طرح ملک کے زیادہ سیاست دان جو دراصل فوج کے ہاتھوں کھلونا بنے ہوئے ہیں، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ملک چھوڑنے سے قبل مجھے خیر پور میں ''وطن دوست اسٹوڈینٹ فیڈریشن'' کے ایک اجلاس میں تقریر کرنے کا موقع ملا تھا۔ اسی زمانے میں محمد خان جونیجو جو کہ وزیر اعظم پاکستان تھے انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ اب اس ملک سے مارشل لاء کا وجود ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم ہو چکا ہے اور اب کبھی بھی مارشل لاء نہیں آئے گا۔ میں نے اپنی تقریر میں ان سے سوال کیا کہ ایک ایسا شخص جو دراصل خود مارشل لاء کی پیداوار ہو ایسا دعویٰ کیونکر کر سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کے پاس اتنی طاقت بھی نہیں کہ آپ اپنے اصل آقا کا سامنا کر سکیں اور آنے والے وقت نے میری بات کو سچ کر دکھایا۔ جب جنرل ضیاء الحق نے اپنے قلم کے صرف ایک اشارے سے انہیں ایوانِ اقتدار کے دالانوں سے مکھی کی طرح نکال باہر کیا۔

سوال: مستقبل کے بارے میں آپ کے کیا عزائم ہیں؟

مری: میں ایک لمبے عرصے کیلئے وطن واپس آیا ہوں اور موجودہ سیاسی حالات کا جائزہ لینے کے بعد ہی دوبارہ سرگرم ہوں گا۔

(ہفت روزہ ''نیوز انٹرنیشنل'' سنہ......۱۹ع)

جنزل شیروف (شیر محمد مری)

طارق اشرف

22 فروری 1977ء پر ہوم سیکریٹری (سندھ) کے آرڈر پر حیدر آباد سینٹرل جیل کے تمام B کلاس سیاسی قیدیوں کو جیل بدر کر کے سکھر سینٹرل جیل بھیجا گیا۔ میرے ساتھ حکیم ببر، راجہ رحیم کھاوڑ، نادر چانڈیو، نظیر چانڈیو، محمد علی، ماسٹر حنیف اور کا کا لعل چند تھے۔

کا کا لعل چند کی عمر تقریباً 70 سال تھی دِکھنے میں بہت بوڑھے نظر آتے تھے ان کی نظر بھی کمزور تھی۔

سکھر سینٹرل جیل میں ہم شام پانچ بجے پہنچے تھے۔ گیٹ پر ہمارے سامان کی چیکنگ ہوئی۔ پھر ہمیں سپیریئر کلاس بھیجا گیا۔ اندر پہنچے تو دیکھا یہ وارڈ بہت بڑا تھا۔ سامنے دو لائنوں میں کرسیاں لگی ہوئیں تھیں۔ کرسیوں پر دو تین نوجوان اور ایک بزرگ آدمی جس کے چہرے پر ڈاڑھی تھی، موجود تھے۔ جب ہم ان کے قریب گئے تو سب نے اٹھ کر ہمارا استقبال کیا۔ اور محبت کے ساتھ ہم سے بغلگیر ہوئے۔ اسی اثناء میں ایک چھوٹے قد کا گول مٹول سا شخص میرا نام لے کر مجھ سے آکر ملا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ کون شخص ہے؟ جو مجھے پہچانتا ہے۔ اس نے اپنا تعارف کرایا تو پتہ چلا کہ وہ عبدالصمد پانیزئی تھا۔ حیدر آباد میں ایک دو مرتبہ ہماری ملاقاتیں ہو چکی تھیں اس نے وہاں موجود لوگوں سے میرا تعارف کرایا پھر میں نے اپنے ساتھیوں کا تعارف کرایا۔

سکھر جیل میں موجود زیادہ تر لوگوں کا تعلق نعب NAB) بلوچ اسٹوڈنٹ آرگنائزیشن سے تھا۔ ڈاکٹر عنایت وہاب، اسلم کرد، ڈاکٹر رزاق، سردار عبدالصمد پانیزئی، (ڈاڑھی والا شخص) یہ تمام وہاں موجود تھے ان لوگوں نے ہماری تواضع خشک میوے اور گرین ٹی سے کی۔

اچانک تمام بلوچ اور پٹھان لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم بھی کھڑے ہو گئے۔ سامنے سے

Scanned with CamScanner

ایک شخص آ رہا تھا۔ پُر وقار اور باحشمت چہرہ بلوچوں جیسی لپٹی ہوئی سفید ریش کاندھوں سے نیچے تک لٹکی ہوئی سفید زلفیں پیروں میں بلوچی سینڈل سر پر سفید پگڑی لانبا سا کُرتا۔ چال میں ایک طرف جھکاؤ تھا۔ ان کے باوقار چہرے پر ایسی حشمت چھائی ہوئی تھی کہ کچھ لمحوں تک تو ہمارے دلوں پر ان کی حشمت اور دہشت کا خوف چھایا رہا۔ لیکن وہ خوف ڈرانے والا نہیں تھا بلکہ عقیدت والا تھا۔ ماندل شر نے ان کا تعارف کروایا۔ یہ سائیں ''شیر محمد مری صاحب'' ہے۔ یقیناً آپ لوگ ان کے نام سے واقف ہوں گے۔ لیکن میں نے نگاہیں اٹھا کر اس عظیم ہستی کو دیکھا میرے سامنے بلوچوں کا نڈر سردار جنرل شیروف موجود تھا۔ سچ میں وہ ایک جنرل کی طرح ہی نظر آ رہے تھے۔ جب سردار صاحب نے میری طرف نگاہ کی تو مجھے یوں لگا جیسے ان کی نگاہیں میرے بدن کو پار کر کے اندر تک جھانک رہی ہوں۔ ہم نے پُر جوش انداز میں ان کا استقبال کیا، ماندل شر نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا:

''سائیں یہ طارق اشرف ہے سندھی کے مشہور جدید سوہنی کے ایڈیٹر ہیں'' میر شیر محمد صاحب ہم سے سندھی میں مخاطب ہوئے۔ پٹھانوں اور بلوچوں میں وہ واحد فرد تھے۔ جو سندھی زبان میں بات چیت کرتے تھے ورنہ باقی لوگوں میں سے کسی کو سندھی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

میر شیر محمد صاحب نے میرے ساتھیوں سے پوچھا کہ کون سی سیاسی پارٹی سے تعلق ہے آپ کا؟

راجہ رحیم، حکیم ببر، ہادی اور نظیر نے کہا کہ: ہمارا تعلق جئے سندھ اسٹوڈنٹ فیڈریشن سے ہے۔ محمد علی نے بھی اُردو میں بتایا کہ میرا تعلق بھی جئے سندھ سے ہی سمجھئے۔ وہاں موجود پٹھان اور بلوچ چونک گئے۔

میر شیر محمد نے سوال کیا۔

کیا آپ سندھی نہیں ہیں؟

محمد علی نے کہا:

سمجھئے کہ میں بھی سندھی ہوں کیوں کہ پلا بڑھا بھی سندھ دھرتی پر ہوں۔

میر صاحب نے کہا:

''سندھ میں پیدا ہوئے وہاں پلے بڑھے ہو، کھاتے پیتے ہو، اور پھر بھی تمہیں سندھی

Scanned with CamScanner

نہیں آتی ؟''

محمد علی نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا: بس تھوڑی تھوڑی اچّھی تھی۔ میر صاحب ماسٹر حنیف کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

آپ کہاں کے ہو؟

حنیف نے جواب دیا۔

میر پور خاص کا۔

میر صاحب نے ان کے لہجے سے اندازہ لگا لیا تھا تو یہ بھی سندھی نہیں ہے۔ اُسی وجہ سے انہوں نے سوال کیا کہ

آپ اصل سندھی ہے؟

حنیف نے کہا:

نہیں میں نیا سندھی ہوں۔

میر صاحب نے سوال کیا کہ:

''آپ کو کتنا عرصہ ہوا ہے سندھیوں میں بسے ہوئے۔''

حنیف نے کہا:

تیس یا پینتیس سال ہوئے ہونگے:

یہ سن کر میر صاحب نے تھوڑا تیز لہجے میں کہا:

تیس پینتیس سال سے آپ سندھ میں رہتے ہو۔ پھر بھی خود کو نیا سندھی سمجھتے ہو۔ آپ کو اور کتنے سال چاہئے اصل سندھی ہونے میں اتنے عرصہ میں آپ سندھی زبان بھی نہیں سیکھ سکے۔ یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے۔

ماسٹر حنیف خاموش ہو گئے:

آہستہ، آہستہ اسلم، وہاب، دو مہاجر بھائی عظیم، اقتدار اور کچھ پٹھان اور بلوچ قیدی ہم سے قریب آ گئے۔ لیکن میر شیر محمد ہم سے زیادہ بے تکلف نہ ہوئے۔ ہم میں سے بھی کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ ان کے پاس جا کر بے تکلف ہونے کی کوشش کریں۔ کیونکہ ان کا رکھ رکھاؤ حشمت ایسی تھی کہ ہم ان کے سامنے جانے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ باقی سب لوگ تو پورا دن گھومتے پھرتے تھے

Scanned with CamScanner

یا کرسیوں پر بیٹھ کر گپ شپ لگاتے رہتے لیکن میر صاحب کا تو جیسے ایک شیڈول بنا ہوا تھا۔ صبح سویرے وہ ٹھنڈے پانی سے نہاتے پھر لمبے بالوں کو سکھا کہ بالوں اور داڑھی کو کنگھی کرتے پھر ٹیپ ریکارڈر پر سہگل کے اور پرانے فنکاروں کے نغمے سنتے پھر تیار ہو کر درخت کے نیچے پڑی ہوئی کرسی پر آ کر بیٹھ جاتے۔ ہمارے سوا باقی تمام افراد وہاں جاتے تھے۔ وہاں پر میر صاحب ناشتہ بھی کرتے اور لوگوں سے سیاسی تبادلہ خیال بھی کرتے آخر میں وہ اخبار اٹھاتے اور اپنی بیٹھک میں جا کر مطالعہ کرتے گھنٹے ڈیڑھ کے مطالعہ کے بعد وہ پھولوں کی کیاریوں میں لگ جاتے تھے۔

مختلف پودوں اور پھولوں کے بیج اکٹھا کرتے ان کو اس بات پر فخر تھا کہ وارڈ میں لگے ہوئے زیادہ تر آم کے درخت بلوچ قیدیوں نے لگائے تھے جو ایوب دور میں وہاں قیدی رہ چکے تھے۔ خاص طور پر میر پسند خام اور ان کے ساتھی گیارہ بجے تک میر صاحب اپنی بیٹھک کے پچھلی طرف لگے ہوئے آم کے درخت کے سائے میں ٹیبل کرسی لگواتے اور قریب دو گھنٹے تک وہاں پہ لکھنے کا کام کرتے رہتے تھے۔ لکھنے کے دوران وہ شور شرابے کو بالکل پسند نہ کرتے تھے اور وہاں موجود تمام افراد اسی بات کا خیال رکھتے تھے کہ لکھنے کے دوران میر صاحب کے بیچ کوئی چیز مُخل نہ ہو۔

دوپہر کو میر صاحب اپنی بیٹھک میں تنہا بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد قیلولہ فرماتے۔ ٹھیک شام کے پانچ بجے وہ اٹھتے بیٹھک کے پچھلی طرف لگے ہوئے آم کے درختوں کے بیچ واک کرتے۔ یہ واک قریب ایک گھنٹے تک جاری رہتی۔ واک سے فراغت کے بعد وہ ہمارے پاس آتے اور کرسی پر بیٹھ کر سیاسی حالات پر گفتگو کرتے۔ زبردست قسم کی سیاسی بحث چھڑ جاتی تھی۔ سیاسی معاملات پر تبادلہ خیالات ہوتا۔ اس کے بعد وہ اپنی بیٹھک میں جا کر کتابوں کا مطالعہ کرتے شام کو جب بیرک میں بند ہونے کا وقت آتا تو سب سے پہلے وہ خود بند ہوتے۔ ان کا کہنا تھا کہ جیل میں آنے کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں اور ان آداب کا احترام کرنا چاہئے۔ شروع میں ان کے ساتھ ڈاکٹر رزاق اور اسلم کرد رہتے تھے۔ لیکن بعد میں وہ دوسری بیرک میں چلے گئے۔

میر صاحب کی بیرک بہت بڑی تھی۔ اس کے اندر قریب سو (100) لوگوں کے رہنے کی گنجائش تھی۔ مگر میر صاحب اکیلے ہی اس میں رہتے تھے۔ رات کا کھانا وہ تنہا کھاتے تھے۔ رات کو گیارہ بجے تک اونچی آواز میں ریڈیو چلتا تھا۔ گیارہ کے بعد ریڈیو بند ہو جاتا۔ میر صاحب کے ساتھ جتنا بھی وقت گزرا مجھے ان کے ٹائم ٹیبل میں کبھی بھی فرق محسوس نہ ہوا۔ ہاں جس دن وہ

Scanned with CamScanner

کورٹ جاتے تو تھوڑا ٹائم میں فرق آ جاتا تھا۔

میں شروع میں میر صاحب کی بیرک کے پچھلی طرف بنی ہوئی بیرک میں رہتا تھا اور جب بھی میر صاحب کی بیرک کے سامنے سے گزرتا تھا تو اکثر انہیں کھڑکی کے پاس بیٹھے دیکھتا تھا۔ کبھی کتاب کے مطالعہ میں مصروف تو کبھی ڈاڑھی کو لپیٹتے ہوئے جب بھی ہماری آنکھوں کا ٹکراؤ ہوتا تو میں ہاتھ جوڑ کر سلام کرتا تھا جواب میں مجھے مخاطب ہو کر کہتے سائیں کیسے ہو! ایک دن میں نے اسلم سے سوال کیا۔ میر صاحب مزاج کے کیسے ہیں؟ مجھے ان سے بات چیت کرنے کی خواہش ہے۔ لیکن اس لئے ان کے پاس جانے سے رہ جاتا ہوں کہ پتہ نہیں کون سے وقت کون سی مصروفیت ہے۔ یہ نہ ہو کہ میرے جانے سے ڈسٹرب ہو جائیں۔

اسلم نے کہا: ''آپ شوق سے جایئے میر صاحب مزاج کے بہت اچھے ہیں!'' ایک دن وہ ناشتہ کر کے اپنی بیرک میں واپس آئے تو میں ان کے پاس چلا گیا۔ میر صاحب کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھے میں نے پاس آنے کی اجازت طلب کی تو وہ اپنی نشست سے کھڑے ہوئے اور کہا ''آ جاؤ سائیں'' اور اپنی ساتھ والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میں نے کرسی پر سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا:

''مجھے آپ کے ٹائم ٹیبل کا کچھ اندازہ نہ تھا۔ میں آپ کا وقت ضائع تو نہیں کر رہا ہوں۔''

میر صاحب نے جواب دیا۔ ''کیسا ٹائم ٹیبل مجھے خوشی ہوئی کہ آپ یہاں آئے ہیں۔''

میں نے کہا: ''میں نے کافی بار آنے کا سوچا تھا لیکن ڈرتا تھا کہ آپ ڈسٹرب نہ ہو جائیں۔ آپ کے خالی وقت کا پتہ نہ تھا۔''

میر صاحب نے کہا: ''میں خود آپ سے ملاقات کرنا چاہتا تھا لیکن وہ لوگ پتہ نہیں کون ہیں؟'' میر صاحب کا اشارہ میرے ساتھیوں کی طرف تھا۔ کچھ لمحے رکنے کے بعد میر صاحب نے پوچھا ''واقعی ان کا تعلق جئے سندھ سے ہی ہے'' میں نے جواب دیا:

حکیم ببر تو واقعی جئے سندھ کا ہے باقی نظیر بہادی کا کچھ پتہ نہیں۔ ہاں میں البتہ راجہ کے لئے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ جئے سندھ کا نہیں ہے۔ میر صاحب نے مجھے گھورتے ہوئے کہا: لیکن راجہ نے تو خود تعارف کروالیا تھا کہ وہ جئے سندھ کا ہے۔ اس نے پھر جھوٹ کیوں بولا؟

میں نے کہا: اس لئے کہ جئے سندھ اسٹوڈنٹس فیڈریشن ایک قوم پرست جماعت ہے اور

Scanned with CamScanner

قوم پرستوں کی آپ بھی عزت کرتے ہیں!

کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد میر صاحب بولے: ماسٹر حنیف کون ہے کیا آپ اسے بہت اچھی طرح پہچانتے ہیں؟

میں نے کہا: نہیں میں انہیں زیادہ نہیں جانتا سینٹرل جیل حیدرآباد میں ہم سے الگ رہتا تھا کورٹ آتے جاتے کبھی کبھار اس سے ملاقات ہو جاتی تھی۔

میر صاحب نے پوچھا:

''ہم ایسے بندوں سے کتراتے ہیں پتہ نہیں کون ہوں اس لئے بہتر ہے آپ ہم سے تنہا ملا کرو۔''

میں نے کہا: بہتر ہے آئندہ آپ سے تنہائی میں بات چیت ہوا کرے گی پھر میں نے کہا: آج میں حیدرآباد سنوائی کے لئے جا رہا ہوں۔ آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتایئے: میر صاحب نے کہا: نہیں کسی چیز کی ضرورت نہیں البتہ اگر آپ اپنے میگزین سوہنی کے کچھ پرچے لا سکیں تو لیتے آیئے گا۔ میں نے کچھ تو پڑھے ہیں اور کچھ کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔ جب میں حیدرآباد سے واپس آیا تو سوہنی کے کچھ پرچے ساتھ لے آیا تھا۔ میں نے وہ میر صاحب کو دیئے وہ شوق سے ان کا مطالعہ کرنے میں مصروف ہو گئے۔

کچھ دنوں بعد میں بیرک تبدیل کر کے میر صاحب کے سامنے والی پانچ نمبر کھولی میں رہنے آ گیا۔ ایک دن میر صاحب کے پاس گیا تو وہ سوہنی کا مطالعہ کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے کہا: ''میں نے آپ کے میگزین کا مطالعہ کیا ہے اگر آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔'' میں نے کہا ''بالکل کہیے۔''

میر صاحب نے میگزین کو نیچے رکھا اور کہنے لگے ''میں نے سندھی زبان کے اور بھی میگزین دیکھے ہیں۔ آپ کا پرچہ ان سے بہت اچھا ہے۔ پھر بھی میں نے ایک بات محسوس کی ہے۔ آپ عام لوگوں کی یعنی سندھ کے عوام کی بات نہیں لکھتے۔ صحیح معنوں میں آپ کے عوام کسان ہیں۔ آپ نے کسانوں اور زرعی مزدوروں کی بات ہی نہیں کی۔ آپ ان کے لئے نہیں لکھتے:

میں نے جواب دیا:

''آپ بجا فرماتے ہیں لیکن میں خود لوئر (Lower) مڈل کلاس کا بندہ ہوں۔ اس

کلاس کے اپنے بھی مسائل ہیں اور انہیں بھی تو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں روزگار نہیں ملتا۔ زندگی کے اور بھی بہت سے مسائل ہیں۔ ہمارے ساتھ بہت سی زیادتیاں ہو رہی ہیں۔ ان پر بھی تو لکھنا پڑتا ہے۔''

میر صاحب کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ چھا گئی اس مسکراہٹ میں سے طنز بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ میر صاحب نے کہا:

''آپ شوق سے مڈل کلاس کے مسائل پر لکھیں، ان کے روزگار کے مسائل پر لکھیں، لیکن طارق صاحب ایک بات کا خیال رکھئے کہ میں نے آپ کے میگزین کا اچھی طرح مطالعہ کیا ہے آپ نے ملازمتوں کے حصول پر زیادہ زور دیا ہے۔ لیکن ملازمت ہمیشہ محمد خان جونیجو جیسے بندوں کو ملے گی۔ آپ اور ہمارے جیسے بندے ہمیشہ جیل میں بند رہیں گے۔ آپ کسانوں کی بات کریں نچلے طبقے کی بات کریں۔

میں نے کہا: آپ کی بات سو فیصد درست ہے۔ لیکن کسانوں کے لئے لکھنے سے بہتر ہے۔ ان کے لئے تحریک شروع کی جائے، کسانوں کے لئے ادب لکھا جائے گا لیکن وہ پڑھ تو نہیں سکتے اور یہ بھی ممکن نہیں کہ میں لکھنے لکھانے کا کام بھی کروں میگزین بھی نکالوں اور ساتھ میں کوئی عملی تحریک بھی شروع کروں۔ ہر بندے کی اپنی ایک فیلڈ ہوتی ہے۔ جہاں پر وہ بہتر انداز میں کام کر سکتا ہے ہر کام ہر ایک بندہ نہیں کر سکتا۔

میر صاحب نے کہا: تو پھر آپ ایسے بندے تیار کریں جو گاؤں، گوٹھوں میں عملی کام کریں۔

ایک دن میں اپنی کھولی میں بیٹھا ہوا تھا کہ اسلم کرد نے آ کر بولا آپ کو بابا بلا رہے ہیں۔ اسلم اور کچھ دوسرے لوگ میر صاحب کو ''بابا'' کے نام سے بلاتے تھے۔ میر صاحب حسبِ معمول آم کے درخت کے نیچے ٹیبل کرسی رکھے ہوئے لکھنے میں مصروف تھے۔

میں ان کے پاس پہنچا تو میر صاحب نے میرے لئے کرسی منگوائی، جب میں بیٹھ گیا تو میر صاحب نے کاپی بند کی قلم کو ڈھکن لگایا اور کہا کہ:

میں نے آپ کو اس لئے بلایا ہے کہ آپ سے کچھ بات چیت کی جائے میں نے جواب دیا۔ ''آپ کی مہربانی آپ نے یاد کیا۔'' پھر تھوڑے وقفے کے بعد میں نے سوال کیا۔ آپ کیا لکھ رہے تھے۔ میر صاحب نے کہا: ''بس فارغ بیٹھے ہوتے ہیں لکھنا بھی وقت گزارنے کا ایک ذریعہ

Scanned with CamScanner

بنایا ہوا ہے۔'' میں نے سوال کیا موضوع کونسا ہے؟ ''تقسیم ہند کے بعد تاریخ لکھ رہا ہوں۔ جو کچھ میں نے دیکھا ہے یا جو کچھ میں جانتا ہوں۔'' میں نے کہا: ''پھر یہ تو زبردست چیز ہوگی۔'' مسکراتے ہوئے میر صاحب نے جواب دیا: ''اچھا لکھنا آتا تو زبردست چیز بنتی ہم تو وقت گزارنے کے لئے قلم چلاتے رہتے ہیں۔'' کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد میر صاحب نے پوچھا: آپ کی طرف کیا ہورہا ہے؟ پھر میرے جواب دینے سے قبل ہی وہ بول پڑے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خاموشی چھائی ہوئی ہے۔

میں نے کہا: ''ایسا بھی نہیں ہے خاموشی ہوتی تو جئے سندھ کے نوجوان شاگرد جیلوں میں کیوں وقت بہ وقت بڑھتے جاتے۔ سندھی کتابوں، رسالوں اور پریس پر پابندی کیوں لگتی۔ شاہ محمد شاہ، ابراہیم منسی اور میں جیلوں میں کیوں بند ہوتے ہم ظلم وستم کے خلاف احتجاج کررہے تھے اس لئے تو جیلوں میں بند کئے گئے ہیں۔ میر صاحب میری باتوں سے مطمئن نہ ہوئے اور کہا: ''آپ بہت پیچھے ہو'' ہم بلوچوں سے بہت پیچھے ہو۔''

میں نے کہا: ہم پیچھے نہیں ہیں مجبور ہیں سائیں جی۔ ایم۔ سید نظر بند ہیں اور کوئی لیڈر رہے ہی نہیں:

طلبہ میں بہت سے گروپ ہوگئے ہیں جئے سندھ والوں میں جذبہ قلب ہے ہمت بھی ہے۔ لیکن وہ منظم نہیں ہیں ان کے پاس صحیح قیادت نہیں۔ انہیں کوئی بہتر (Guide) گائیڈ کرنے والا نہیں۔ وہ نوجوان حد سے زیادہ جذباتی ہیں ون یونٹ کے وقت میں ہم خاموش نہ تھے ون یونٹ توڑنے کے لئے ہم نے بھرپور جدوجہد کی ہے۔ ایوب اور یحیٰی جیسے ڈکٹیٹر کا ہم نے ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے۔ بھٹو کی غلط پالیسیوں کے خلاف بھی ہم نے آواز بلند کی۔

میر صاحب نے کہا: ''لیکن آپ کے ہاں کوئی مضبوط سیاسی پارٹی نہیں ہے۔ کوئی منظم جماعت نظر نہیں آتی۔ نہ ہی کوئی خاص پروگرام نظر آتا ہے۔ ہم بلوچوں کو دیکھو مسلسل جدوجہد کرتے آرہے ہیں۔ اپنے حقوق کے لئے ہم نے جو جنگ لڑی وہ آپ نے نہیں لڑی۔ میں نے کہا: ''آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن آپ کے حالات اور میرے حالات میں بہت فرق ہے۔ آپ کے پاس لیڈر سب ہے ''

میر صاحب نے میری بات پوری ہونے سے پہلے مجھے ٹوک دیا۔ اور پوری بات نہیں

Scanned with CamScanner

ہونے دی: اور کہا ''ہمارے پاس کوئی لیڈر نہیں سب سردار ہیں۔'' میں نے کہا: ''وہ سردار ہی تو لیڈر ہیں ہر قبیلہ کا سردار ہی تو لیڈر ہے اور قبیلے میں اتحاد و تنظیم ہے۔ قبیلہ سسٹم ہونے کی وجہ سے آپ منظم ہیں لیکن نہ تو ہمارے پاس کوئی قبیلہ ہے نہ ہی کوئی سردار۔ اس کی وجہ سے ہم منتشر ہیں۔

میر صاحب نے کہا:

''آپ کو پتہ ہے سردار تو بہت ہے لیکن ہمارا ساتھ تو صرف تین سردار دے رہے ہیں۔''

میں نے کہا: ''وہ تین سردار ہی تو بلوچستان پر چھائے ہوئے ہیں ان کے قبیلے ہی بڑے قبیلے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ بھٹو اور ایوب سے ٹکر لے سکتے ہیں۔ قبیلہ سسٹم ہونے کی وجہ سے ہی آپ منظم ہیں۔ کچھ پل خاموش رہنے کے بعد میں نے کہا۔ ''میر صاحب آپ کا علاقہ پہاڑی ہے آپ لوگوں کے پاس اپنے دفاع کے لئے ہتھیار بھی ہے۔ آپ کا بچہ بچہ بندوق چلانا جانتا ہے۔ لیکن ہمارے یہاں بچوں نے کیا بڑوں نے بھی بندوق نہیں دیکھی۔ دوسروں کو تو چھوڑیئے۔ خود میں نے پہلی مرتبہ رائفل قریب سے اسی وقت دیکھی تھی جب پولیس ہمیں حیدرآباد سینٹرل جیل سے سکھر لے کر آ رہی تھی۔ اس کے علاوہ سندھ شاعروں اور صوفیوں کی سرزمین رہی ہے۔ صوفیوں نے تو ہمیشہ یہی سبق سکھایا ہے کہ اگر کوئی زیادتی کرے تو کرنے دو لیکن تم کسی سے لڑنا مت۔ ہماری عوام پر صوفی ازم کا بہت اثر ہے۔''

میں حیدرآباد شنوائی پر جا رہا تھا میر صاحب سے پوچھا کہ ''آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتایئے گا۔''

میر صاحب نے کہا: ''نہیں میرا کوئی خاص کام نہیں'' لیکن ایک رشین کتاب ہے (Short History of the World) اگر مل جائے تو لیتے آنا۔

شنوائی پر رسول بخش پلیجو ملنے آئے تھے اور اس نے سوال کیا کہ ''آپ کونسی کتاب پڑھ رہے ہو۔ اور آپ کو کسی کتاب کی ضرورت تو نہیں ہے''۔ میں نے میر صاحب کے حوالے سے ذکر کیا اور ان کو مطلوبہ کتاب لانے کے لئے کہا۔ کتاب تین جلد میں تھی اُس وقت صرف دو جلد ہی دستیاب ہو سکیں اس کے علاوہ پلیجو صاحب نے اپنی عوامی تحریک کی جانب سے شائع کی ہوئی کتابوں کا ایک سیٹ میرے لئے اور ایک سیٹ میر صاحب کے لئے دیا۔

سکھر واپس پہنچ کر میں نے وہ کتب کا سیٹ میر صاحب کے حوالے کیا۔ میر صاحب کو

شارٹ ہسٹری آف دی ورلڈ (Short History of the World) کی ایک جلد نہ ملنے پر افسوس ہوا۔

ایک دن میں اپنی کھولی میں بیٹھا ہوا تھا۔ میر صاحب میری کھولی میں آئے مجھے خوشی بھی ہوئی اور حیرت بھی کیونکہ میں جانتا تھا کہ میر صاحب کسی کے پاس بھی نہ جاتے تھے۔ ایک مرتبہ جب ولی خان جیل میں تھے اور عید کے موقع پر اس نے تمام کو دعوت دی تھی۔ تو باقی لوگ تو گئے تھے مگر میر صاحب نہ گئے۔ آخر ولی خان خود چل کر آئے تو پھر میر صاحب کو جانا پڑا تھا۔

میر عبدالواحد کرد (سینیٹر) روز شام کو آتے تھے (وہ اے کلاس میں تھے اور کافی دور پولیٹیکل وارڈ میں رہتے تھے) تو تمام بلوچ اور پٹھان جا کر دروازے پر ان کا استقبال کرتے تھے۔ لیکن میر صاحب کبھی بھی بیرک کے باہر نکل کر ان سے نہ ملتے تھے۔ عبدالواحد کرد ہمیشہ جا کر ان سے ملتے تھے جتنا وقت بھی میں میر صاحب کے ساتھ رہتا میں نے کبھی ان کو کسی کی کھولی یا بیرک میں جاتے نہیں دیکھا۔

جب میر شیر محمد میرے پاس آئے تو مجھے خوشی بھی اور تعجب بھی ہوا۔

میر صاحب کرسی پر آ کر بیٹھے، پاس میں ریڈیو ٹیپ ریکارڈر پڑا ہوا تھا۔ ٹیپ ریکارڈر کو انہوں نے دیکھا اور سوال کیا:

اس کی قیمت کتنی ہوگی؟

میں نے جواب دیا: ''دو سال پہلے اٹھارہ سو کا لیا تھا۔''

ان کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ نظر آئی۔ جیسے کہہ رہے ہوں بہت فضول خرچ کیا ہے۔ پھر بستر پر پڑے ہوئے کھیس (کمبل) کو دیکھتے ہوئے کہا: سندھ میں کھیس (کمبل) بہت اچھے بنتے ہیں۔ یہ کہاں کا بنا ہوا ہے؟

میں نے جواب دیا: ''خیر پور کا'' اور جلدی سے وضاحت کی کہ یہ مجھے میری پھوپھی کی طرف سے گفٹ ملا تھا۔ میر صاحب کافی دیر تک بیٹھے ہوئے مختلف موضوعات پر بہت بات چیت کرتے رہے، پھر کہا: میں نے پلیجو صاحب کی دی ہوئی کتب کا مطالعہ کیا ہے وہ کس قسم کے آدمی ہیں؟

میں نے کہا: ''ترقی پسند خیالات رکھتے ہیں۔''

پوچھا: ''کرنا کیا چاہتے ہیں؟''

Scanned with CamScanner

میں نے جواب دیا: ''یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔''

میر صاحب نے کہا: ''کیا آپ کی ان سے زیادہ جان پہچان نہیں ہے؟''

میں نے کہا: ''بہت پرانی سلام دُعا ہے قریب بارہ تیرہ سال سے ان کے ساتھ میل جول ہے۔لیکن پلیجو صاحب کیا کرنا چاہتے ہیں اب تک میں اُس بات پر کلیئر نہیں ہوں لیکن ان کی پارٹی بہت منظّم ہے۔ جہاں بھی انہوں نے کام کیا ہے اپنے حمایتی پیدا کیئے ہیں۔البتہ وہ درست کام کر رہے ہیں یا غلط وہ تو آگے چل کر پتہ چلے گا:

پوچھا: ''جام ساقی کو آپ جانتے ہیں۔''

میں نے جواب دیا: یہاں شاگرد لیڈروں میں وہ پہلے دوست ہیں لیکن 1970ء کے بعد ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔

میر صاحب نے سوال کیا: ''کس قسم کا بندہ ہے؟''

میں نے کہا: ''جب تک وہ مجھ سے ملتا رہتا تھا اُس وقت تو وہ ایماندار، محنتی، وعدے کا پکا اور بہت اچھا انسان تھا۔اب کیا ہے۔یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

پوچھا: ''اب وہ کیا کر رہا ہے؟''

میں نے جواب دیا: ''مجھے نہیں پتہ اب وہ کیا کر رہا ہے۔سنا ہے وہ انڈرگراؤنڈ ہو گیا ہے۔''

کچھ دیر تک میر صاحب سے مختلف باتیں ہوتی رہیں پھر میں نے میر صاحب سے سوال کیا کہ:

''نعب (NAB) ترقی پسند پارٹی ہے پھر وہ اپنے منشور سے مکر کیوں گئی؟ اور آپ نے اپنی پارٹی کو منشور سے مکرنے پر روکا کیوں نہیں؟''

میر صاحب نے کہا: ''آپ کو شاید یہ پتہ نہیں ہے میں نعب (NAB) کا عام ممبر بھی نہیں ہوں اور نہ ہی میں نعب (NAB) کو ترقی پسند پارٹی سمجھتا ہوں۔لیکن ہمارے مفادات کے قریب ترین پارٹی نعب (NAB) ہے اُس لئے ہم نے اُس کا ساتھ دیا۔''

میں نے سوال کیا: ''آپ تو نیشنلسٹ ہو، آپ کو اپنی زبان سے محبت ہونی چاہئے پھر کیوں آپ نے بلوچستان کی سرکاری زبان بلوچی ہونے پر زور نہ دیا؟''

میر صاحب نے کہا: ''یہ تو ہماری بدقسمتی ہے ہم نے زور دیا تھا لیکن نعب (NAB) کے مفاد میں یہ بات کہی تھی خود غوث بخش بزنجو نے بلوچی کو سرکاری زبان بنانے کی مخالفت کی ہے۔

Scanned with CamScanner

ہمارے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ کوئٹہ اور بلوچستان کے کچھ حصوں میں پختون بھی اکثریت میں ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ بلوچی کے ساتھ ساتھ پشتو کو بھی سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔ پختون خواہ نعب (NAB) کا زور بھی اس بات پہ تھا لیکن ہم لوگ پشتو کو سرکاری زبان بنائے جانے کے مخالف تھے۔ بزنجو نے کہا صرف بلوچی زبان کو زیادہ اہمیت دیں گے تو فساد ہوں گے۔ اسی وجہ سے بلوچی، بلوچستان کی سرکاری زبان نہ بن سکی۔ مجھے تو یہ بات پسند نہیں۔ لیکن ہم پٹھانوں کی وجہ سے مجبور ہیں۔ کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد میر صاحب پھر بولے: ''حقیقت یہ ہے کہ بلوچستان کے پٹھان انہیں بے وقوفی کے سبب ہماری تحریک کو سپوتاژ کر رہے ہیں۔ یہ جو پٹھان جیلوں میں پڑے ہیں۔ آپ کیا سمجھتے ہو یہ لڑ کر آئیں ہیں، نہیں یہ تو ہلاّ گلاّ کرنے اور محض غنڈہ گردی کرنے کے لئے آئے ہیں۔ خواہ مخواہ کا شور مچایا ہے۔ پہاڑوں پر پٹھان نہیں بلوچ لڑ رہے ہیں۔ بلوچ اپنے خون کا نذرانہ دے رہے ہیں۔ سچ میں تو پٹھانوں اور بلوچوں میں سخت اختلاف ہے۔ ہماری پوری تحریک کا پٹھانوں نے ستیاناس کر دیا ہے۔

پٹھانوں اور بلوچوں میں کچھ اچھے لوگ بھی موجود تھے۔ خاص طور پر ڈاکٹر عنایت، وہاب، اسلم کرد، عبداللہ، احمد فاروق، ڈاکٹر ارباب، سردار عبدالصمد، میر عبدالواحد کرد اور بہت سے دوسرے۔ لیکن میں اُن تمام میں سے میر شیر محمد سے بہت متاثر ہوا۔ میر شیر محمد کی شخصیت پُر وقار بھی تھی اور دلچسپ بھی۔ وہ بھی آہستہ آہستہ بات کرتے تھے۔ بحث کے دوران بھی ان کی آواز اونچی نہ ہوتی تھی لیکن وہ جب طنزیہ جملہ کہتے تھے تو وہ بات پرچھائی کی طرح دل میں اُتر جاتی تھی۔ لیکن وہ زیادہ تر طنزیہ بات کرنے سے پرہیز کرتے تھے اور طنزیہ مسکراہٹ پر ہم اکتفا کرتے تھے۔

اُن کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان کی نظریں جسم کے اندر تک جارہی ہوں۔

لیکن سب سے زیادہ اُن کی جس بات نے مجھے متاثر کیا وہ تھی ان کی سندھ دھرتی سے محبت، ان کو سندھ اور سندھ کے لوگوں سے بہت محبت تھی اور فکر تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ سندھ کے لوگ بیدار ہو کر کوئی مئوثر تحریک چلائیں:

میں کبھی کبھی میر صاحب کے پاس چلا جاتا تھا۔ ادب وسیاست پر گفتگو ہوتی تھی۔ (کیونکہ میر شیر محمد بلوچی زبان کے بڑے لکھاری، بلوچی نثر، بلوچی شاعری اور دوسرے موضوعات پر ان کی

کتب شائع ہو چکی ہے۔)

میر صاحب تین مرتبہ میرے پاس چل کر آئے تھے ایک مرتبہ جب میری طبیعت ناساز تھی تو دلاسہ دینے آئے تھے اور دو مرتبہ کچہری کرنے کے لئے آئے تھے اور ہاں ایک مرتبہ تب آئے تھے جب ڈیپلائی صاحب گرفتار ہو کر آئے تھے۔

ایک مرتبہ ہم تمام، میں، حکیم پیر، نظیر، ہادی اور راجا میر صاحب کے پاس گئے تھے۔ میر صاحب اپنی کتب کو کھولی میں رکھوا رہے تھے تو میر صاحب نے ہم سے سوال کیا۔

''کتابیں پڑھنی ہیں؟''

ہم نے کہا: ''جی پڑھیں گے۔''

میر صاحب نے ہر ایک کو اپنی من پسند کتاب منتخب کرنے کو کہا، کمیونسٹ لٹریچر تھا۔ ماؤزے تنگ، لینن، مارکس وغیرہ۔ خشک لٹریچر تھا۔ میں نے بھی ایک کتاب منتخب کی میر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا: ''یہاں کوئی رومانوی ناول نہیں ہے۔ خشک کتابیں ہیں پڑھ سکو گے؟''

میں تو خاموش رہا۔ باقی سب نے کہا۔ ''بالکل سائیں پڑھیں گے۔''

میر صاحب نے کہا: ٹھیک ہے سب ایک ایک کتاب لے جائیں جب پڑھ لیں تو دوسری مانگ لینا۔

صبح کا وقت تھا روزانہ ناشتہ کے بعد پٹھان اور بلوچ کوئی کسی کونے میں، کوئی کسی درخت کے نیچے تو کوئی کسی بیرک میں دو تین گھنٹے کتب بینی کرتے تھے۔ میرے ساتھیوں کو بھی جوش چڑھا وہ کتابیں لے کر کونے کھدروں میں بیٹھ گئے اور کتابوں میں سر کھپانے لگے۔ شام ہوئی تو میرا دوست حکیم پیر بولا: ''یار صبح سے شام ہوگئی ہے آدھی سے زیادہ کتاب کو پڑھ تو لیا ہے مگر ایک بھی شبد سمجھ میں نہیں آیا۔''

میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا: ''یہ کتاب رکھو اور میر صاحب سے اور کوئی کتاب لے آؤ۔''

حکیم نے جواب دیا: ''چھوڑو یار مجھ سے یہ ایک نہیں پڑھی جا رہی تو دوسری کتاب کو لے کر کیا کرنا اور مصیبت میں پڑ جاؤں گا۔ اگر میر صاحب نے کتاب کے متعلق پوچھ لیا تو؟''

اور ہوا بھی یہی حکیم تو بچ گیا لیکن راجہ پھنس گیا۔ شوق یا میر صاحب پہ رعب جھاڑنے کے لئے کتاب تو ہر ایک بندہ لے آیا تھا۔ لیکن مطالعہ کسی نے بھی نہیں کیا۔ خود میں لائی ہوئی کتاب کے

Scanned with CamScanner

کچھ ورق الٹانے کے بعد کتاب کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ ایک دن سب بیرک کے باہر درخت کے نیچے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور تاش کھیل رہے تھے اچانک میر صاحب وہاں آ گئے اور کہا:

''آپ لوگ جیل میں آئے ہو۔ یہ بہت اچھا موقعہ ہے اس موقعہ سے فائدہ اٹھاؤ۔ زیادہ سے زیادہ پڑھو میں نے دیکھا ہے کہ آپ لوگ پڑھتے کم نہیں ہو۔''

پھر انہوں نے راجہ سے سوال کیا: ''آپ نے کتاب کا مطالعہ کیا ہے؟''

راجہ نے پھر سچ بول دیا: ''نہیں سائیں!''

میر صاحب نے راجہ کو سرزنش کرتے ہوئے کہا: آپ اسٹوڈنٹ ہو، سندھ یونیورسٹی میں طلبہ یونین کے عہدیدار بھی ہو اور سیاست بھی کر رہے ہو۔ لیکن آپ مطالعہ نہیں کرتے ہو۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔

پھر میر صاحب نے راجہ سے سیاسی معاملات پر گفتگو کی لیکن راجہ سیاست پر کیا بات چیت کرتا۔ میر صاحب بہت مایوس ہوئے خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے۔

پھر انہوں نے تھوڑی دیر بعد اسلم کو بھیج کر میرے علاوہ سب سے کتابیں واپس منگوا لی پھر اس کے بعد انہوں نے کبھی بھی راجہ، حکیم، نظیر اور ہادی سے سیاسی موضوع پر گفتگو نہیں کی۔ یہ اس کے بلند کردار اور اصول پسندی کا ثبوت ہے۔

میں نے بھی میر صاحب سے لی ہوئی کتاب نہیں پڑھی۔ لیکن میر صاحب کو واپس نہیں کی۔ میں کسی کی کتاب چراتا تو نہیں ہوں لیکن جب میر صاحب سکھر جیل سے حیدر آباد جیل بدلی ہو رہے تھے تو میں نے جان بوجھ کر اُن کو کتاب واپس نہیں کی تھی۔ ایک یادگار سمجھ کر۔

اس کتاب پر میر صاحب کی لکھی ہوئی ایک تحریر موجود تھی۔ ایک مرتبہ میر صاحب نے مجھے بھی ٹوکا تھا: ''طارق صاحب آپ بھی مطالعہ نہیں کرتے ہو۔ آپ کو تو پڑھنا چاہئے۔ اس سے اچھا موقعہ اور نہیں آئے گا۔ اطمینان سے مطالعہ کریئے گا۔''

میر صاحب سے جب بھی گفتگو ہوئی یا بحث چھڑی تو میر صاحب ایک ہی شکایت کرتے تھے کہ:

''سندھی قوم ابھی بیدار نہیں ہوئی، منظم نہیں ہوئی، کوئی بھی تنظیم یا لیڈرشپ سندھ میں نہیں ہے۔''

Scanned with CamScanner

کسی حد تک میر صاحب کی یہ بات سچ بھی تھی لیکن میں ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ: ''نہیں سائیں ہماری قوم سوئی ہوئی نہیں ہے ہم بیدار ہیں سیاست ہمارے نچلے طبقے تک چھائی ہوئی ہے۔ ہمارا کسان اور مزدور بھی کافی سیاسی سمجھ بوجھ رکھتا ہے۔ ایک مسئلہ ضرور ہے کہ مناسب لیڈر شپ نہیں ہیں۔''

بھٹو صاحب یہ چاہتے ہیں کہ سندھ میں ان کے ٹکر کا کوئی اور لیڈر پیدا نہ ہو۔ وہ سندھ میں تھوڑی بھی مخالف برداشت کرنا نہیں چاہتے۔ جئے سندھ کے تمام لیڈروں پر وارنٹ نکلے ہوئے ہیں شاہ محمد گرفتار ہو چکے ہیں۔ اس کے باوجود جئے سندھ کے نوجوان پُر جوش انداز میں کام کر رہے ہیں۔ شاہ محمد ایک اچھے طالب علم لیڈر ہیں حوصلہ مند ہیں، سیاسی سمجھ بھی رکھتے ہیں اور نوجوانوں کے ساتھ بھی ہیں۔ دوسری طرف رسول بخش پلیجو صاحب کام کر رہے ہیں۔ دونوں کے کام کرنے کا انداز الگ الگ ہیں مگر دونوں کے اچھے خاصے حلقے موجود ہیں۔ بس یہ ہے کہ جب بھی صوفیوں کو متحد ہونے کا موقع ملا تو ایک اچھی منظّم تنظیم بن جائے گی۔

لیکن میر صاحب نے کبھی بھی میری بات سے اتفاق نہیں کیا۔ بس وہ ایک ہی بات ہمیشہ کرتے تھے کہ: ''طارق صاحب بلوچوں اور صوفیوں کے مفادات ایک ہیں اگر کبھی یہ ہوا کہ سندھیوں پر کوئی آفت آئی تو بلوچ بھی خود کو محفوظ نہ سمجھیں گے۔ اس لئے یہ بات ضروری ہے کہ بلوچ اور سندھی مل کر کام کریں۔''

ہم سب میر صاحب کی بہت عزت کرتے تھے۔ میر صاحب کو کبھی بھی میں نے نہیں دیکھا کہ وہ کسی کو (تو) کر کے مخاطب کریں وہ کسی سے بھی مخاطب ہوتے تو ''آپ'' کر کے مخاطب کرتے تھے بھلے وہ چھوٹا ہو یا بڑا۔

میر صاحب جب خاموش سوچ بچار میں ہوتے یا مطالعہ کر رہے ہوتے تو وہ یہ چاہتے کہ اس وقت کوئی بھی انہیں ڈسٹرب نہ کرے۔ اگر کوئی ان گھڑیوں میں داخل ہوتا تو صرف میر صاحب اتنا کہتے ''سائیں فرمایئے کیا چاہیئے؟'' تو آنے والا خود بخود لوٹ جاتا۔

ایک دن تمام لوگ بیٹھے ہوئے تھے تو ماسٹر حنیف نے میر صاحب کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: ''میر صاحب آپ ایک تاریخی شخصیت ہیں تو میر صاحب چونک گئے'' اور کہا ''کیا میں تین ہزار سال پرانا ہوں جو تاریخی بن گیا ہوں'' وہاں موجود تمام لوگوں نے قہقہہ لگایا۔ بعد میں میں نے

ماسٹر حنیف سے کہا آپ نے خوامخواہ غلط بات کر کے ہم سب کو نشانہ بنایا، زندہ آدمی تاریخی کیسے ہو سکتا ہے۔ البتہ یہ کہتے کہ: ''میر صاحب آپ تاریخ کا حصہ بنتے جا رہے ہو۔'' لیکن ماسٹر حنیف اپنی ضد پر اڑے رہے۔

میر صاحب سے ایک مرتبہ کچھ باتیں ہو رہی تھیں کہ میر صاحب نے مجھے بتایا ان کو تین سال ہو گئے ہیں لیکن انہوں نے کبھی بھی گھر کوئی خط نہیں بھیجا۔ سبب یہ ہے کہ گھر والوں کو پتہ ہے کہ جیل میں ہیں اور زندہ ہیں۔ میر شیر محمد نے دیر سے شادی کی تھی اس لئے ان کے بچے ابھی چھوٹے ہیں بیٹا ایک دو مرتبہ ملنے کے لئے آیا تھا میں نے جیل کے اندر دو باتیں محسوس کیں جو تمام لوگوں میں ایک سی (Common) تھیں۔ پٹھان میں بھی اور بلوچوں میں بھی وہ ہر ایک بندے سے کہتے ہیں کہ وہ ایجنسیوں کا بندہ نہ ہو۔ ماندل شر کے بقول میری شخصیت کے متعلق وہ جماعتِ اسلامی کے پرچوں میں مخالفت مضامین پڑھ چکے ہیں اور یہ بھی جانتے تھے کہ میں رجعت پرست نہیں ہوں۔ اس لئے مجھ پر تھوڑا اعتماد کرتے تھے باقی لوگوں سے وہ دور بھاگتے تھے خاص طور پر ماسٹر حنیف کے لئے ہنوز کو آخر تک شک رہا کہ ___ کا بندہ ہے۔ حالانکہ اُسے قتل کیس میں پچیس سال کی سزا ہوئی تھی۔

دوسری بات یہ تھی کہ: جس سے میر شیر محمد بھی مبرا نہ تھے کوئی بھی نئی خبر سنتے کتنی بھی چھوٹی خبر ہو وہ ایک دم رائے قائم کرتے تھے کہ ''بس اب بھٹو گیا۔''

آج بھٹو کی نیند اُڑ گئی ہوگی۔ سچ میں بھٹو صاحب کی نیند اُڑ گئی ہوگی یا نہیں۔ لیکن یہ لوگ خوش ہوتے تھے کہ بھٹو کی نیند خراب ہوگی۔

جب تربیلا ڈیم کی سُرنگ ٹوٹی تھی تو بھی وہ لوگ چلّا اٹھے تھے ''بس اب بھٹو گیا'' میں نے کہا سُرنگ ٹوٹنے سے بھٹو کا اقتدار کیسے جائے گا۔ کہنے لگے ضرور جائے گا بس آپ دیکھتے رہو۔

ایک دن میر صاحب نے بتایا کہ: ''میں نے رات کو ماسکو ریڈیو سے خبریں سنی ہیں کہ برزنیف نے کانفرنس میں کہا ہے کہ: ''ہماری بلوچستان معاملے پر پوری نظر ہے۔''

پھر میر صاحب نے کہا: ''اب تو بھٹو کو دست لگ گئے ہوں گے۔'' روزانہ کسی نہ کسی بات پر کوئی نہ کوئی یہ کہتا ہے: آج بھٹو کو سر درد ہوا ہوگا۔ آج بھٹو کو قے آ گئی ہوگی وغیرہ۔

ایک دفعہ میر صاحب حسبِ عادت آم کے درخت کے نیچے کرسی پر بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے

Scanned with CamScanner

تھے میرا وہاں سے گذر ہوا تو آواز دی۔ برداشتی ایک اور کرسی لے کر آیا۔ بہت سی باتیں ہوئیں، باتوں باتوں میں میر صاحب نے بتایا کہ "کافی دن پہلے ایک مرتبہ مجھے ہائی کورٹ لے کر گئے تھے۔ پولیس کا سخت پہرا لگا ہوا تھا چاروں طرف پولیس والے رائفلیں اور بندوقیں تانے کھڑے تھے۔"

بیرسٹر عزیز اللہ کے ساتھ ایک سندھی لڑکا مجھ سے ملنے کے لئے آیا پھر ذہن پر زور دینے کے بعد مجھے اس کا نام بتایا مدد علی سندھی اس کا نام تھا۔

بلوچوں کا ذکر نکلا تو میر صاحب نے کہا "ہمارے اوپر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے ہیں۔ ہر حکومت نے ہم پر ستم کیا ہے۔ لیکن جو تھوڑی بہت کثر رہ گئی تھی وہ بھٹو نے پوری کر دی ہے۔ خاص طور پر تو میرے قبیلے پر بھٹو صاحب نے بہت عتاب نازل کیا ہے۔

میرا قبیلہ بلوچستان کا سب سے بڑا قبیلہ ہے۔ باہر کے ایک صحافی نے لکھا ہے کہ "جب میں بلوچستان میں مرن ٹرائیب میں گیا تو وہاں مجھے کوئی انسان نہیں ملا۔ گھر ٹوٹے پھوٹے پڑے ہیں چولہے میں اَدھ جلی ہوئی لکڑیاں پڑی تھیں۔ یہاں تک کہ جو لوگ افراتفری میں نکلے ہیں تو چولہے پر پڑے دیگچے اب بھی موجود ہیں۔ پورا مرن ایریا ویران ہو گیا ہے۔ دور سے میں نے ایک گدھے کو دیکھا اس کی پیٹھ پر کوئی چیز لدی ہوئی تھی جب گدھے کے قریب پہنچا تو میں کانپ گیا۔ وہ ایک بچے کی نعش تھی اور اُس میں کیڑے پڑ گئے تھے۔ وہاں سے بھاگتے ہوئے لوگوں میں سے ایک ماں اپنے لختِ جگر کو بھی راستے میں چھوڑ گئی تھی۔ اپنے رسم و رواج کے متعلق میر صاحب نے بتایا کہ ہمارے یہاں پر چھوٹے بڑے کا فیصلہ سردار کرتا ہے اور سردار کا فیصلہ ہر ایک کو ماننا ہے۔ اگر کسی نے سردار کے فیصلے سے انکار کیا تو پھر قبیلہ کا کوئی بھی فرد اُس سے تعلق نہیں رکھے گا اس کا سوشل بائیکاٹ ہو جائے گا۔ یہ بھی کہا کہ ہمارے یہاں پردے کا اہتمام نہیں ہوتا۔ کنوئیں سے پانی بھرتے ہوئے اگر کوئی مسافر وہاں سے گذرا اور اس نے کسی عورت سے پانی مانگا تو عورت اُس کو برتن میں پانی دے گی۔ پانی پینے کے بعد وہ مسافر برتن عورت کے ہاتھ میں لوٹانے کے بجائے برتن نیچے زمین پر رکھے گا کہ برتن لوٹانے کے بہانے وہ عورت کو دیکھ نہ سکے اگر کسی نے زبردستی برتن عورت کے ہاتھ میں دینے کی کوشش کی تو عورت وہ برتن ہاتھ میں نہیں لے گی۔

جیلوں کی حالت زار کے متعلق میر صاحب نے بتایا کہ: "سندھ کی طرح بلوچستان میں بھی قیدیوں پر ظلم کئے جاتے ہیں۔ چار چار سال تک قیدی بغیر پیشی کے بیٹھے ہوتے ہیں اور جب کیس

Scanned with CamScanner

چلتا ہے تو سزا سے زیادہ قیدی سزا کاٹ چکا ہوتا ہے۔''

جب بلوچستان میں نعب (NAB) اور جمعیت کی مخلوط حکومت بنی تو جیلوں کی حالت سدھارنے کے لئے ایک تین رکنی کمیٹی بنائی گئی۔ جس میں سردار خیر بخش اور میں بھی تھا۔ ہم نے دوسری سفارشات کے ساتھ ایک سفارش یہ بھی کی کہ قیدی کیس کے فیصلہ آنے سے قبل جتنی بھی قید کاٹ چکا ہو اس کی چھوٹ دے کر باقی سزا پر عمل کیا جائے۔

میر صاحب نے بتایا کہ ''میر خان جیلوں کے وزیر تھے'' انہوں نے اُس دور میں جیلوں کے اندر پنکھے لگوائے تھے اُن پنکھوں کا اِن کو آج یہ فائدہ ہے کہ آج تک وہ خود جیل میں ہے تو ان پنکھوں سے مفید ہو رہے ہیں۔

میر صاحب کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ خاص طور پر کمیونزم کے موضوع پر وہ کافی زبانوں پر عبور رکھتے تھے باوجود اُس کے کہ میر صاحب کسی بھی اسکول میں نہ پڑھے تھے۔

میر صاحب کی سادگی کو دیکھتے ہوئے ایک مرتبہ جج نے ان سے سوال کیا: ''آپ کو انگریزی زبان آتی ہے؟''

میر صاحب نے دوٹوک جواب دیا: ''ہاں مجھے انگلش میں صرف گالی دینا آتی ہے۔''

جج میرے جواب کو سن کر خاموش ہو گئے۔

میر صاحب نے بتایا کہ انہیں نو (9) سال کے لئے جلاوطن کیا تھا۔

بلوچستان نکالی ملنے کے بعد وہ سندھ یونیورسٹی میں (اولڈ کیمپس) ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے پاس رہتے تھے اکثر سندھی ادبی بورڈ جاتے تھے۔ محمد ابراہیم جویو اور غلام ربانی سے اچھے تعلقات تھے۔ میر شیر محمد مری اور سردار خیر بخش مری، کامریڈ حیدر بخش جتوئی کے نمازِ جنازہ میں بھی شریک ہوئے تھے۔

میر شیر محمد مری کے ساتھ ڈھائی مہینے تک رہنے کا اتفاق ہوا۔ مجھے بھٹو صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ ان کی وجہ سے مجھے جیل کے اندر میر شیر محمد مری جیسی شخصیت سے ملنے کا اتفاق ہوا۔

میر شیر محمد مری کی ایک بات جواب تک میرے دل پر لکھی ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ: ان کا کہنا تھا کہ: ''جو بندہ جس دھرتی پہ رہتا ہے وہاں کھاتا پیتا ہے اور وہ اس دھرتی سے پیار نہیں کرتا تو وہ احسان فراموش اور غدار ہیں۔''

Scanned with CamScanner

آج کا سندھ تبدیلی کا متمنی ہے

جنرل شیروف کا ایک خط ہفت روزہ ''صبحِ سندھ'' کراچی کے ایڈیٹر کے حوالے سے
''سندھی قوم کے نام!''

ساتھی!

چند دن پہلے اپنے پیارے دوست نواب خیر بخش مری کے یہاں سے ''صبحِ سندھ'' کے دو شمارے ملے۔ میں نے سوچا کہ خط لکھ کر آپ سے معلوم کروں کہ آپ نے آخر مجھے ''صبحِ سندھ'' سے محروم کیوں رکھا ہے؟ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کو میرے ایڈریس کی عدم موجودگی کا بنیادی مسئلہ درپیش ہو۔

دل نے چاہا کہ اپنے دوستوں اور سسّی پنوں کے پیار کے سنگم ''سندھ'' کے عوام کے ساتھ مختصر طور پر کچھ بات چیت کروں، لیکن آج کل میری صحت بہت خراب رہتی ہے۔ یہ ہماری دلی خواہش ہے کہ ''صبحِ سندھ'' کے توسط سے سندھ اور اہلِ سندھ کے متعلق جان کاری رکھیں۔

میں نے اپنی جلاوطنی کے عرصہ کے دوران سندھ میں ہر ابھرتی صبح کو دیکھا۔ لیکن دھندلی صبح، تھکی ہوئی اور تھکا دینے والی صبح، داغ داغ صبح، بھوک اور افلاس کی صبح، وڈیرا شاہی کے ظلم و جبر میں سسکتی مدھم مدھم صبح۔ وادی مہران میں رہتے ہوئے میں نے ایسی کئی صبحیں دیکھی ہیں۔ لیکن شاید اب نئی صبح یا صبحِ سندھ طلوع ہونے کی امیدیں قریب دکھائی دیتی ہیں۔ لہٰذا سندھ کا ''صبحِ سندھ'' اگر ہمیں ارسال فرمائیں گے تو بڑی مہربانی ہوگی۔

دو شمارے جو مجھے میسر ہوئے ہیں ان کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سندھ کی تکمیل تو ابھی دور کی بات ہے، البتہ اس تکمیل کی ابتداء ابھی ابھی شروع ہوئی ہے، وہ ایک بنیادی تبدیلی کا

Scanned with CamScanner

متمنی ہے، جس کے لئے فی الحال طلبہ برادری جدوجہد کر رہی ہے۔

اس سے انکار ممکن نہیں کہ پاکستان کے ہر حصہ اور ہر قوم کی ترقی پسند اور قومی تحریکیں ایک ہی کمزوری کا شکار ہیں۔ بلوچستان، سندھ اور سرحد یا سندھ کی ترقی پسندوں کی ایک ہی بنیادی کمزوری رہی ہے کہ جن نظریات کے وہ مدعی ہیں ان نظریات سے ہتھیار بند ہو کر عوام کو وہی انداز دینے میں ناکام رہے ہیں، اور وہ ہتھیار یہ ہے کہ نظریہ اور عمل کا ملاپ اور عوام میں گھل مل جانا ہے۔

کیا کوئی بھی ترقی پسند اور بالخصوص سندھ کے کامریڈ اس حقیقت سے انکار کر سکیں گے؟ تمام دوست مختلف اور مخصوص خامیوں کی عملی راہ اور پالیسی کی بات تو کرتے ہیں لیکن اس کی عملی راہ اور عام پالیسی کو بھول جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ ترقی پسند ڈگمگا کر گمراہ ہو رہے ہیں اور کبھی دائیں جانب اور کبھی بائیں جانب دیکھ رہے ہیں اور آج تک عجیب وغریب طریقوں، نت نئے خود ساختہ اور نام نہاد فلسفوں کی تشریح کی شکل ہم پر حاوی ہے۔

ہمارے ترقی پسند شاید یہ بھول جاتے ہیں کہ پالیسی اور تدابیر تحریک کی روح ہوتی ہیں۔

ہم قوم، قومیت اور طبقاتی جدوجہد کا مطالبہ کرتے ہوئے کافی حد تک تاریخ کی مادی تشریح پر کم اور تصوریت پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں۔

اپنی اَنا کو تسکین دینے کے لئے ہمارے بہت سارے دوست یہ سمجھتے ہیں کہ سامراج اور دیگر استحصال اور جارحانہ قوتیں یا تو خود بخود ہتھیار پھینک دیں گی یا پھر اسلامی سوشلزم، اسلامی مساوات اور شاعرانہ انداز کی تقریروں سے ختم ہو جائیں گی۔

ہمارے دوست یہ بات بھول جاتے ہیں کہ استحصالی اور جابر قوتیں نہ تو خود بخود ختم ہو جائیں گی اور نہ ہی خودکشی کر لیں گی۔

ہمارے دوست عوامی بالادستی قائم کرنے کے لئے دوست اور دشمن کے درمیان امتیاز کو نہ پہچان سکے ہیں۔ میرے خیال میں اس چھان بین کے لئے اور عوامی اور طبقاتی جدوجہد کے لئے کوششیں نہ صرف یہ کہ ناکافی بلکہ بہت کم ہوئی ہیں۔ جس کے نتیجہ میں محنت کش، مزدور اور ہاری طبقہ گمراہ ہوتا رہا ہے۔

میرے خیال میں جب تک ہم مذکورہ کمزوری اور بے نیازی سے نجات حاصل نہیں کریں گے تب تک عوام کے حقیقی دوستوں کے ساتھ اتحاد نہ کر سکیں گے۔

Scanned with CamScanner

اور یہ بھی کہ ایک اہم اور بنیادی مسئلہ کہ سچے دوست اور دشمن کی پہچان اور تجزیہ کیسے ممکن ہے؟ اس بنیادی اور اہم تجزیاتی نقطہ نظر کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ مثال کے طور پر سندھی دوستوں نے سندھی سماج کے مختلف معاشی حالات اور ان کا انقلاب کی جانب رویہ کا تجزیہ نہیں کیا ہے اور نہ ہی اس بنیادی اور اہم مسئلہ کی جانب توجہ دی جارہی ہے۔

مجھے جب بھی سندھی دوستوں کے ساتھ ملاقات کا موقعہ ملا ہے انہوں نے عجیب وغریب انداز میں اپنی عوام کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ وہ صرف ''کتاب پرستی'' میں جکڑے ہوئے ہیں، اور مایوس کن انداز میں یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے عوام بہت غریب اور مفلس ہیں۔

اس بات میں شک نہیں کہ عوام غریب اور مفلس ہیں، لیکن میں نے اپنی سالہا سال کی عملی جدوجہد میں اس بات کا مشاہدہ کیا ہے کہ غربت تبدیلی کی خواہش کو، عمل کی خواہش کو اور انقلاب کی تمنا کے ایک اعلیٰ عزم کو جنم دیا ہے۔

یہ حقیقت جو میں پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتا ہوں یقیناً حیرت انگیز ہے کہ بلوچستان کی دس سالہ جدوجہد میں کوئی بھی نام نہاد لیڈر شامل نہیں تھا اور نہ ہی محض کتابی انداز میں، چائے اور کافی کی چسکیوں پر خالص قومی سوشلسٹ انقلاب کی آمد کے تمنائی۔ حالانکہ یہ بات ہر کوئی جانتا ہے کہ ہم مر جائیں گے، ہماری نسلیں ختم ہو جائیں گی لیکن خالص قومی سوشلسٹ انقلاب نہ کہیں آیا ہے اور نہ ہی آئے گا۔

ہمارے ساتھ المیہ یہ بھی ہے کہ ہم نے تضادات کا درست طور پر تجزیہ نہیں کیا ہے۔ ہم اس وقت بہت سارے تضادات بالخصوص مندرجہ ذیل تین قسم کے تضادات سے نبرد آزما ہیں۔

ایک تو وہ تضادات ہیں جو ہمارے اور ہمارے جدید نوآبادکاروں کے درمیان ہیں۔

دوسرے وہ تضادات ہیں جو ایک تاریخی قوم اور جذباتی نعرہ باز قوم کے درمیان ہیں۔

تیسرے وہ تضادات ہیں جو عوام کے درمیان ہیں۔ یہ تضادات اپنی ماہیت میں دیگر تضادات سے مختلف ہیں۔

ایک اور تضاد جو عمومی طور پر ہر جگہ اور بالخصوص سندھ میں ابھر کر سامنے آرہا ہے وہ یہ کہ سندھ کے ترقی پسندوں اور قومی تحریک میں اجتماعی مفادات اور انفرادی مفادات کا تضاد۔

آج پاکستان میں طبقوں، قوموں اور سیاسی گروہوں کے درمیان تضادات اب ایک مخصوص

Scanned with CamScanner

مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں، جنہیں حل کرنے کے لئے ایک بلند ترین شکل کی صورت ہے۔

پاکستان میں ہماری تحریک چونکہ مرکزیت نہیں رکھتی لہٰذا اس کا موجودہ ابھار نہ صرف یہ کہ ایک خوش آئندہ علامت بلکہ ایک عظیم واقعہ ہوگا۔

ہماری تحریک کے کامریڈوں پر اب مشکل گھڑی آ پہنچی ہے۔ دیکھتے ہیں کہ ہاری اسے قبول کرتے ہیں یا رَد کرتے ہیں۔ یہ بات ہماری تحریک کے کامریڈوں کے رویہ پر منحصر ہے، لیکن اس کے کئی امکانات ہیں۔ اس میں قابلِ غور نقطہ یہ ہے کہ اگر تحریک کو تیز کرنے سے پہلے ہی پیش قدمی شروع کی گئی تو یہ بات انتہائی غلط اور مہلک ثابت ہوگی۔

اور جیسا کہ سندھ کے پیروں، میروں، وڈیروں اور جاگیرداروں کا تعلق ہے۔ وہ زیادہ دیر تک زندہ نہ رہ سکیں گے، کیونکہ یہ طبقات ہمیشہ ذلت آمیز اور بدترین بداعمالیوں کے مرتکب رہے ہیں۔

آئندہ انتخابات میں آپ کے پُرفریب نعرہ بازی کے باوجود مذکورہ بالا طبقات اپنی بداعمالیاں جاری رکھیں گے۔ ذلت اور بدترین بداعمالیوں کے علاوہ ان سے کوئی امید نہیں کی جاسکتی۔

دل تو چاہتا ہے کہ اور بھی بہت کچھ لکھوں لیکن صحت کی ناسازی کے باعث زیادہ ہم کلام نہیں ہوسکتا۔ اور خط کو یہیں ختم کرتا ہوں۔ امید ہے کہ ''صبحِ سندھ'' مسلسل ارسال فرمائیں گے۔

آپ کا
شیر محمد مری
بلوچستان
ہفت روزہ ''صبحِ سندھ''
15 اگست 1970ء

Scanned with CamScanner

منصور قادر جونیجو سندھ کے سیاسی، ادبی اور سماجی حلقوں میں ایک منفرد پہچان رکھتے ہیں۔ وہ سندھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں گھاڑی میں پیدا ہوئے جو ضلع دادو میں واقع ہے۔ زمانہ طالب علمی سے وہ جئے سندھ تحریک سے وابستہ رہے۔ انہوں نے سندھی میں بائیس کتابیں لکھیں اور سندھ کے مختلف رسائل اور اخبارات میں ان کے کئی سو مضامین چھپ چکے ہیں۔ ان کے زیادہ تر مضامین Research Paper کی شکل میں ہیں۔

سندھ یونیورسٹی میں جساف کے آرگنائزر اور سندھی ادبی سنگت کے سیکریٹری رہے، انہوں نے سارک (سندھ اینالائسز اینڈ ریسرچ کاؤنسل) کے نام سے ایک ریسرچ فورم قائم کیا۔ انہوں نے اینٹی کالا باغ ڈیم ایکشن کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے کالا باغ ڈیم مخالف جدوجہد چلائی اور سندھی عوام کو بیدار کیا۔ بعدازاں وہ اتحاد ملکی سطح پر بننے والے اتحاد Pakistan Oppressed Nations Movement پونم کا حصہ بن گیا۔ سندھ میں پونم اتحاد بنا تو منصور قادر جونیجو پونم سندھ کے سیکریٹری اطلاعات مقرر ہوئے۔

انہوں نے اپنی علمی و ادبی زندگی میں خلیل جبران کے محبت ناموں، ٹیگور کے فکر اور فلسفے کو سمجھتے ہوئے شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شاعری کی روح میں ڈوب کر قومی سیاست میں اپنا منفرد کردار ادا کرتے ہوئے سن سے نکلتے ہوئے قومی سورج سائیں جی ایم سید کے ساتھ سیاسی سفر کا ہمسفر بنتے ہوئے اپنی عمر کے 40 سال پورے کئے ہیں۔ اسی دوران انہوں نے زورِ قلم سے ادب، فلسفہ اور سیاست پر گراں قدر کتابیں لکھ ڈالیں۔ جو کہ مکمل تحقیقی اور معلوماتی ہیں۔ مثلاً ٹیگور، خلیل جبران، جنرل ہوش محمد شیدی، سندھ کے شہداء، رئیس غلام محمد بھرگڑی، حُر تحریک اور سُوریہ بادشاہ وغیرہ۔ اُن کا ایک خواب ابھی ادھورا ہے وہ یہ کہ ان کی محبت بھری، سماج تبدیل کرنے والی شاعری جو کہ اب تک منظر عام پر نہیں آئی، وہ شائع ہو جائے۔ منصور نے پاکستان کے قدآور سیاستدانوں سائیں جی ایم سید، ڈاکٹر حمیدہ کھوڑو، نواب شیر محمد مری عرف جنرل شیروف، نواب اکبر خان بگٹی شہید، سردار عطاء اللہ مینگل، قاضی فرید محمد، محمود خان اچکزئی، باچا خان، ولی خان کے ساتھ مل کر کام کیا ہے۔

منصور قادر جونیجو کی زیرِ نظر کتاب جو کہ بلوچستان کی تاریخی شخصیت نواب شیر محمد عرف جنرل شیروف کے متعلق نادر و نایاب مضامین پر مشتمل ہے امید ہے کہ منصور قادر جونیجو کی دیگر کتابوں کی طرح اپنی اہمیت کا لوہا منوائے گی۔

فکشن ہاؤس

18- مزنگ روڈ لاہور

E-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

Ph:042-7249218, 7237430

ISBN 978-969-562-081-6

9789695620816

Scanned with CamScanner